جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

بیاد
محدثِ کبیر عالمِ ربّانی حضرۃ مولانا سیّد حامد میاںؒ

ماہنامہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ / اپریل 2011ء

جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور

سَلام بحضورِ خیرالانام ﷺ

حضرت سید نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی! محبوبِ کُل جہاں کو ، دِل و جگر کا سلام پہنچے
نَفَس نَفَس کا دُرُود پہنچے، نَظَر نَظَر کا سلام پہنچے

بِساطِ عالَم کی وُسعتوں سے ، جہانِ بالا کی رِفعتوں سے
مَلک مَلک کا درُود اُترے ، بَشر بَشر کا سلام پہنچے

حُضورؐ کی شام شام مہکے ، حضورؐ کی رات رات جاگے
مَلائکہ کے حَسیں جلَو میں ، سَحر سَحر کا سلام پہنچے

زبانِ فِطرت ہے اِس پہ ناطِق، بِبارگاہِ نَبیؐ صادق
شَجر شَجر کادُرُود جائے، حَجر حَجر کا سلام پہنچے

رسُولِ رحمتؐ کا بارِ اِحساں ، تمام خلقت کے دوش پر ہے
تو اَیسے مُحسِن کو بَستی بَستی، نگر نگر کاسلام پہنچے

مِرا قَلَم بھی ہے اُن کا صدقہ، مِرے ہُنَر پر ہے اُن کا سایہ
حضورِ خواجہؐ ، مِرے قلم کا ، مِرے ہُنَر کا سلام پہنچے

یہ اِلتجا ہے کہ رُوزِ مَحشر ، گُناہگاروں پہ بھی نَظَر ہو
شَفیعِ اُمتؐ کو ہم غریبوں کی چشمِ تَر کا سلام پہنچے

نفیسؔ کی بَس دُعا یہی ہے، فقیر کی اب صَدا یہی ہے
سَوادِ طَیبہ میں رہنے والوں کو عُمر بھر کا سلام پہنچے

صلّی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلّم
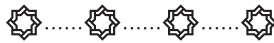
جلد نمبر:3 | جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ/اپریل 2011ء | شمارہ نمبر:10

نگران

حضرت اقدس مولانا **سید رشید میاں** دامت برکاتہم

مدیر

مفتی محمد سعید خان

مجلس مشاورت

- مولانا شیر الرحمٰن
- مولانا حبیب اللہ اختر
- محمد اورنگ زیب اعوان
- کمپوزنگ: سہیل عباس

زر تعاون

فی شمارہ:30روپے، ششماہی:150روپے، سالانہ:300روپے

بیرون ملک

امریکہ، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ

ویسٹ انڈیز، ناروے وغیرہ 30امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط

بحرین، ایران، عمان، انڈیا وغیرہ 25امریکی ڈالر

بنگلہ دیش 20امریکی ڈالر

رابطہ نمبر: 0333-8383337 • 0333-8383336 •

E-Mail: alnadwa@seerat.net

www.seerat.net

پتہ برائے خط و کتابت و ترسیل زر

دفتر ماہنامہ الحامد: الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، مین مری روڈ، چھتر، اسلام آباد پاکستان 46001

مولانا نعیم الدین طابع و ناشر نے پرنٹ یارڈ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''الحامد'' لاہور سے شائع کیا

فہرست مضامین

اداریہ

مسائل کی بنیاد

مدیر کے قلم سے

اس دور میں دینی مدارس کو قائم کرنا اور پھر انہیں جاری رکھنا، جان جوکھوں کا، کام ہے۔ مسائل اور بے پناہ مسائل۔ حکومتی مسائل، معاشرتی مسائل، معاشی مسائل اور اخلاقی مسائل۔ ارباب اہتمام انہیں کن دشواریوں سے کلیۃً حل کرتے ہیں یا پھر ان پر قابو پاتے ہیں، یہ تو انہی کے حوصلے کی بات ہے لیکن ہم غور کریں تو ان تمام مسائل کی اصل بنیاد اخلاقی مسائل ہیں۔ حکومتی مسائل کو لے لیں تو وہ اس لیے کہ ارباب حکومت کی دین سے دوری اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کا نہ ہونا ہے اور جب کوئی شخص یا ادارہ فکر آخرت کو فراموش کردے، تو اس کے نزدیک اخلاقی اقدار تو ثانوی درجے میں چلی جاتی ہیں۔ معاشرتی مسائل پر غور کریں تو ان کے ڈانڈے نفاق سے جا ملتے ہیں اور نفاق، اخلاقیات کا قاتل ہے۔ معاشی مسائل، انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے میں کمی کا واقع ہونا ہے اور بخل سے بڑھ کر کون سی بیماری ہے، جو سخاوت جیسے خلق فاضل کی جڑ کاٹتی ہو۔ الغرض جو بھی بحران ہے، اس کی اصل بنیادی وجہ خود ہم مسلمانوں کی اخلاقیات کا تنزل ہے۔

تاریخ عالم اٹھا کر دیکھ لیجیے، جب بھی کسی طبقے نے عروج اور فکر نے فروغ پایا ہے، ہمیشہ اس کی بنیاد اخلاقیات ہی بنی ہیں، جن افراد اور جماعتوں نے انقلاب برپا کیے ہیں انہوں نے سب سے پہلے اپنی ذات اور فرد سے لے کر اجتماع اور جماعت کو اخلاقی تربیت کے مراحل سے گذارا ہے اور تب کہیں جا کر تبدیلی آئی ہے۔ جن افراد یا جماعتوں نے اپنے کارکنوں کی اخلاقیات کو نہیں سنوارا، یہ تو ممکن ہے کہ وہ

وقتی طور پر کسی معاشرے پر چھا گئے ہوں، لیکن وہ جماعتیں فوراً یا کچھ ہی عرصے میں فنا ہو کر رہ گئیں۔ خواہ ان کا نام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہوا ہو، انسانی اخلاقیات کے بناں ان کی بنیاد ریت پر اٹھائی گئی تھی اور ریت کی بنیاد بھلا کب تک چل سکتی ہے؟

ہمیں اپنے مدارس کی صورت حال کو بھی اس میزان عدل پر جانچنا چاہیے کہ ہمارے ہاں اخلاقیات کا معیار کیا ہے؟ ہمارے نوجوان علماء اور نئی نسل کے فضلاء کا اخلاقی معیار کیا ہے؟

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ نوجوان علماء جب مدارس سے فاتحہ فراغ پڑھ لیتے تھے تو اپنی اخلاقی تربیت کے لیے، اخلاقیات کی تربیت کے مراکز یعنی خانقاہوں کا رُخ کرتے تھے۔ پڑھ لکھ کر عالم بنتے تھے اور ذکر و مراقبہ کے بعد انسان، راسخین فی العلم کا لقب ان پر سجتا تھا اور شاہکار کردگار و نادر روزگار کے خطابات ان پر پھبتے تھے۔

افسوس اس بات پر ہے کہ مراکزِ اخلاقیات کی بربادی کے بعد اب مدارس بھی رو بہ زوال ہیں۔ آہستہ آہستہ ناشدنی، شدنی کی جگہ لے رہی ہے اور دن بدن ناخوب، خوب بنتا جا رہا ہے۔ کسی بھی مکتبۂ فکر اور حتیٰ کی اپنے ہی مکتبۂ فکر کے، کسی بھی صاحب علم و فضل پر پھبتی کسنا، ان کا مذاق اڑانا، کوئی چلتا ہوا جملہ کہہ دینا اور کوئی ریمارک (Remark) پاس (Pass) کر دینا اب کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے قائدین اور جنہوں نے علم و تحقیق میں اپنی سیاہ ڈاڑھیاں عمر بِتا کر سفید کر دیں، ان پر الزام لگا دینا، انہیں کسی کا آلہ کار قرار دے دینا، کسی بھی غیر مسلم ملک یا تنظیم کا ایجنٹ قرار دے دینا، نہایت آسان ہو گیا ہے۔

حالانکہ یہ آسان نہیں، نہایت مشکل ہے۔ روزِ محشر جب زبان سے نکلے ہوئے، ان الزامات کو ثابت کرنا پڑے گا تو کیا بنے گا؟ مشکل تو اس وقت پیش آئے گی۔ آج جو کانٹوں کی فصل بیجی جا رہی ہے، قیامت کے دن یہ کاٹنی پڑے گی اور اس کا کاٹنا کچھ سہل نہیں۔

اھل السنۃ والجماعۃ (دیوبندی مکتبۂ فکر) میں اب کون سا ایسا نامور عالم دین باقی بچا ہے، جس سے اختلاف رائے رکھنے والے اس کے بارے میں پہلا الزام یہ نہیں لگاتے کہ یہ تو ایجنسیوں کا آدمی ہے۔ بغیر کسی ادنیٰ شہادت اور معمولی ثبوت کے محض اپنے گمان بلکہ بدگمانی کو حقیقت سمجھتے ہوئے ، یہ آج کا الزام، کل کو بہت مہنگا بھی پڑ سکتا ہے اور عاقبت برباد بھی ہو سکتی ہے۔اس اخلاقی تنزل کی بھی کوئی حد ہے؟ ہمارے مدارس کے نوجوان فاضل علماء کرام کو چاہیے کہ اس حقیقت پر سنجیدگی سے غور کریں۔اس طرز عمل میں خود اھل السنۃ والجماعۃ ہی کا خسارہ ہے۔اختلاف کو صرف اس کی حد تک ہی رہنا چاہیے اور بڑے ادب کے ساتھ وگرنہ ہونا وہی ہے جو ایک بچے کو کسی تجربہ کار بوڑھے نے جواب دیا تھا۔

قصہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ ایک بوڑھا شریف النفس، کمرخمیدہ، گلی سے گذر رہا تھا۔ایک منچلے نوجوان کو شرارت سوجھی اور اس سن رسیدہ کی جھکی ہوئی کمر کا مذاق اڑانے کو بولا"بابا یہ کمان کتنے میں خریدی ہے؟" تجربہ کار و دانا بوڑھے نے جواب دیا" بیٹے جیتے رہو تو تمہیں میری عمر میں پہنچ کر یہ کمان مفت مل جائے گی" کما تدین تدان

؎ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بہت دن نہیں جاتے کہ مخدوم ملت حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت کی ، ملک کی، ایک بڑی سیاسی جماعت سے الحاق کر لیا تھا۔خوب یاد ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر کتنے شدید الزامات لگائے گئے تھے لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ مرد درویش جب دنیا سے گیا تو ان الزامات سے پاک گیا۔جنھوں نے اس وقت ان پر مالیات کے متعلق زبان درازیاں کیں تھیں اب وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچ چکے۔اب پتہ چلتا ہوگا کہ بغیر کسی تحقیق کے الزامات کتنے مہنگے پڑتے ہیں ۔سیاسی اختلافات کب نہیں ہوا کرتے؟ لیکن اختلاف کو بڑھا کر توہین اور تنقید کو بڑھا کر تنقیص کے درجے میں لے جانا، دانش مندوں کو شیوہ کب رہا ہے۔

کسی کو بھی ایجنسیوں کا ایجنٹ قرار دینے اور کسی بھی صاحب علم تو درکنار مسلمان کی توہین کرنے سے پہلے کم سے کم اس حدیث کو تو یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی بھی دوسرے شخص کے متعلق وہ عیب بیان کرے (تہمت لگائے) جو کہ درحقیقت اس میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ تہمت لگانے والے کو جہنم کی آگ میں بند کر دے گا، یہاں تک کہ اس نے جو تہمت لگائی تھی اس کی سزا پائے [1]

ہم اگر تہمت لگانے والے ہیں تو ہم میں سے کس کی ہمت ہے کہ اس کی سزا کو برداشت کر سکے؟ یہ خوب اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ پھر جب معاملہ علماء کرام کثر اللہ سوادھم کا آ جائے تو صورت حال اور بھی گھمبیر ہو جاتی ہے۔ ان میں جس ذاتِ عالی نے علم اور تقویٰ رکھا ہے، برتن میں کچھ تو صفائی دیکھی ہوگی، جو نوازا ہوگا۔ ہم ان پر تنقید کر کے، ان کے خلاف لکھ کر اور اپنے بیانات ریکارڈ کروا کر، شاید یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دین کی خدمت ہے لیکن ایسے نہیں ہے، یہ جھوٹے الزامات وہ ہتھیار ہیں جو خود ہم اپنے دشمنوں کو فراہم کرتے ہیں۔ اور پھر وقت آنے پر اللہ تعالیٰ اور اھل السنۃ والجماعۃ کے دشمن یہی ہتھیار لے کر ہمارے علماء کرام پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو اس بات پر یقین نہ آئے، تو آپ قادیانیوں کی کتاب ''تاریخ احمدیت'' کو دیکھ لیجیے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف، اس کتاب کو کیسے بطور ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔

پھر یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ اس مظلوم عالم دین یا مسلمان کے دل سے اگر کوئی بد دعا نکل گئی تو پھر کیا بنے گا

غافل ہماری آہ سے نہ رہنا بے خبر کر خوف ایسے تیر سے جو بے کماں چلے

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصلاح اخلاقیات کی توفیق بخشے۔

☼......☼......☼

---

[1] وعن أبي الدرداء رضي اللّٰہ عنہ عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: من ذكر امرأ بشئ ليس فيه ليعيبه به حبسه اللّٰہ فی نار جهنم حتى يأتي بنفاد ما قال فيه. (العجم الاوسط للطبراني، من اسمه مقدام، رقم الحديث: ۸۹۳۶، ج: ٦، ص: ۳۲۷)

درس قرآن مجید

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ

اعوذ باالله من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ. (٣٦)

پھر ڈگمگا دیا آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے اور اِس عیش سے جس میں وہ دونوں تھے ان کو نکال کر چھوڑا اور ہم نے کہا نیچے جاؤ تمہاری حالت یہ ہوگی کہ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور تم کو زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت معین تک۔

تفسیر: پھر شیطان نے ان دونوں آدم وحوا کو اس درخت کی وجہ سے لغزش میں مبتلا کر دیا اور وہ دونوں جس عیش وعشرت اور جس مرتبے اور شان میں تھے اس سے ان کو نکال کر چھوڑا، ہم نے ان کو حکم دیا کہ تم یہاں سے نیچے اتر جاؤ، تمہاری حالت یہ ہوگی کہ تمہارے بعض، بعض کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین میں ٹھہراؤ ہے اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان نے اپنے وسوسہ کی قوت اور طاقت سے حضرت آدم علیہ السلام پر اثر ڈالنا شروع کیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنت کے اندر داخل ہو کر آدم اور حوا سے گفتگو کی ہو اور ان کو اس شجر ممنوعہ کی جانب مائل کیا ہو جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت وقاسمھما انی لکما لمن النٰصحین سے متبادر ہوتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام وحوا جنت کے دروازے میں ہوں اور اس نے باہر کھڑے ہو کر ان سے باتیں کی

ہوں۔ بہر حال ان کے سامنے قسمیں کھا کھا کر اور اپنی خیر خواہی کا یقین دلا کر اور یہ سمجھا کر انکو متاثر کر لیا کہ اس درخت میں یہ تاثیر ہے کہ بشر فرشتہ بن جاتا ہے اور اس کا کھانے والا ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور خدا تعالیٰ نے جو آپ کو اس کے کھانے سے منع کیا تھا وہ تو ابتدائی حالت تھی اور اب تمہاری استعداد قوی ہو گئی ہے لہذا اب کوئی خطرہ نہیں کیونکہ وہ ممانعت کی علت ہی مرتفع ہو چکی ہے۔ غرض حضرت آدم علیہ السلام اور حوا پر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اثر ڈال دیا اور ان دونوں کو ان کے عزم اور پختگی سے ڈگمگا دیا اور پھسلا دیا اور ان کو لغزش دیدی۔ اس پر حضرت حق نے ارشاد فرمایا تم یہاں سے زمین پر اُترو اب تمہاری حالت یہ ہوگی کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اب تمہارے ٹھہرنے اور قرار پکڑنے کی جگہ زمین ہوگی اور ایک وقت مقررہ اور مدت معینہ تک کے لئے زمین میں رہ کر فائدہ حاصل کرو گے۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دو آدمیوں کے نیچے جانے کو جمع کے ساتھ کیوں تعبیر کیا اس لئے کہ آدم علیہ السلام وحوا کے ساتھ ان کی آئندہ ہونے والی اولاد کو بھی شامل کر لیا گیا۔ گویا ان دونوں کو نیچے اترنے کا حکم دینا جملہ بنی نوع انسان کو نیچے اترنے کا حکم دینا تھا۔ زمین کو ایک مدت تک کے لئے مستقر فرمایا اس مدت سے مراد یا تو موت کا وقت ہے یا قیامت تک رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ اس موقعہ پر ہم نے جنت کے زمین پر یا آسمان پر ہونے کی بحث کو چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح شیطان کے جنت میں داخل ہونے کی بحث کو بھی نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ یہ قصہ قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے کسی اور موقعہ پر ان مباحث کا ذکر کر دیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ مفسرین کے اس موقعہ پر مختلف قول ہیں۔ محققین کا مذہب یہی ہے کہ وہ جنت آسمان پر تھی کوئی دنیا کا باغ نہیں تھا، اسی طرح ابلیس کو جنت میں جانا ممنوع نہیں تھا۔ اگرچہ جو عزت وآبرو اس کی پہلے تھی وہ باقی نہیں رہی تھی لیکن جانے آنے کی ممانعت نہیں تھی۔ جب آدم علیہ السلام وحوا کو نیچے جانے کا حکم ہوا اسی وقت

شیطان کو بھی نیچے جانے کا حکم ہوا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ آدم علیہ السلام وحوا، ابلیس، سانپ اور مور، یہ سب بیک وقت زمین پر اتارے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہوا ہوتب تو آپس میں ایک دوسرے کی دشمنی ظاہر ہی ہے اور اگر اھبطوا سے مراد صرف بنی نوع انسان مراد ہوں تب یہ مطلب ہوگا کہ انسان آپس میں ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن ہوں گے۔ چنانچہ جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ(۳۷)

بعد ازاں آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے اور خدا نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کی۔ بیشک وہی بڑا درگزر کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

تفسیر: اس واقعہ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے چند کلمات حاصل کر لیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم کو درگذر فرمایا۔ بے شک وہ بڑی توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس واقعہ پر بڑی ندامت اور پشیمانی ہوئی اور چاہتے ہوں گے کہ معافی طلب کروں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کی رہنمائی فرمائی اور خود ہی ان کو معافی نامہ کے الفاظ سکھا دیئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے کہ جو کلمات حضرت آدم علیہ السلام نے حاصل کئے تھے وہ یہ تھے لا الہ الاانت سبحانك و بحمد ك عملت سوٗ ا و ظلمت نفسی فارحمنی انك انت ارحم الراحمین. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ وہ کلمات یہ تھے۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین. بہرحال حضرت آدم علیہ السلام پر از راہ ترحم توجہ فرمائی۔ اور جب حضرت آدم علیہ السلام وحوا کا معذرت نامہ پیش ہو گیا تو اس کو قبول فرمالیا اور آدم علیہ السلام و حوا کی توبہ قبول کر لی گئی۔ کیوں کہ وہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور بڑا مہربان ہے اور اس سے بڑھ کر مہربانی کیا ہو گی کہ معذرت کے الفاظ بھی خود ہی بتائے اور خود ہی توبہ قبول فرمائی۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب توبہ قبول فرمائی تو پھر جنت میں واپس کیوں نہیں بھیجا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام

کو زمین پر رکھنے میں ہزاروں حکمتیں مضمر تھیں۔ خلافت و نیابت کا کام ان کے سپرد کرنا تھا اس لئے قصور معاف کر دیا۔ لیکن نیچے اترنے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں آدم علیہ السلام کے دل میں اللہ نے کئی لفظ ڈال دیئے۔ اس طرح پکارا تو بخشا گیا۔ وہ سورہ اعراف میں ہیں۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.(۳۸)
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ.(۳۹)

ہم نے حکم دیا تم سب کے سب نیچے اترو اس جنت سے، پھر اگر تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت پہونچے تو جو میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
اور جو انکار کریں گے اور ہمارے احکام کو جھٹلائیں گے تو وہی ولوگ اہل دوزخ ہوں گے وہ اس دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر: ہم نے کہا اور ان کو حکم دیا کہ تم سب کے سب یہاں سے نیچے اتر جاؤ پھر اگر تم کو میری ہدایت و رہنمائی پہنچے اور میرا پیغام ہدایت تم کو وصول ہو تو تم میں جو شخص بھی میری بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کرے گا تو وہ ہر قسم کے خوف اور غم سے بے نیاز ہوگا اور ایسے لوگوں پر نہ کسی قسم کا ڈر ہوگا اور نہ وہ کبھی غمگین ہوں گے مگر ہاں جو لوگ اس پیغام ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور میری نازل کردہ آیات اور براہین کو جھٹلائیں گے تو ایسے لوگ اہل جہنم اور دوزخی ہوں گے اور وہ اس دوزخ میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

یہ حکم محض پہلے حکم کی تاکید ہے اور جن کو حکم دیا گیا ان میں بھی دو احتمال ہیں یا آدم وحوا اور آئندہ ان کی ہونے والی اولاد مراد ہے اور یا پھر آدم وحوا ابلیس، مور اور سانپ مراد ہیں اور اسی طرح لفظ منھا میں بھی دو احتمال ہیں یا تو یہ مطلب ہے کہ جنت سے باہر نکل جاؤ اور یا یہ مطلب ہے کہ آسمان سے نیچے جاؤ۔ بہر حال زمین پر پہنچتے وقت نسل آدم اور بنی نوع انسان کو آئندہ کے لئے یہ پیغام بھی سنا دیا کہ تم زمین میں جا

کر آج کی باتوں کو فراموش کر دو گے۔ پھر میں تمہارے پاس اپنی ہدایت یعنی رسول، اپنی کتابیں اور اپنے احکام بھیجوں گا۔ پھر جو میرے فرستادہ احکام اور میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی صحیح اتباع اور پیروی کریں گے تو وہ ہر قسم کے خوف اور غم سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن جو بدنصیب دین حق کے منکر ہوں گے اور کفر کی روش اختیار کریں گے اور میرے دلائل اور میری نشانیوں اور میری نازل کردہ آیات کی تکذیب کریں گے تو یہ لوگ دوزخ کے مستحق ہوں گے اور یہ اس دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ خوف اس پریشانی کو کہتے ہیں جو آئندہ کسی آفت کے اندیشہ سے ہو اور حُزن اس غم اور پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی مصیبت کے واقع ہو جانے سے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں پر نہ کوئی آفت و مصیبت واقع ہوگی اور نہ ان کو کسی آنے والی مصیبت کا خطرہ ہوگا۔ البتہ دوسرا فریق طرح طرح کے آلام و مصائب اور سخت ترین عذاب میں گرفتار ہوگا۔

اب آگے ان ہی احسانات کے سلسلے میں ان خاص خاص احسانات کا ذکر فرماتے ہیں جو دنیا کی مختلف اقوام پر وقتاً فوقتاً فرمائے ہیں۔ بالخصوص بنی اسرائیل کو خاص طور پر خطاب فرمانے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی ملک میں خاص اہمیت تھی۔ وہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھرانے میں نبوت وحکمت کا سلسلہ عرصہ تک قائم رہنے کی وجہ سے ان کی اولاد کا بہت اعتبار تھا۔ حتٰی کہ تمام اہل عرب ان کی عزت کرتے تھے اور اپنی اکثر باتوں میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اللہ نے بھی اسی وجہ سے ان کو خطاب فرمایا اور اپنے ان احسانات کا اظہار فرمایا جو ہزاروں برس سے ان کے خاندان پر ہوتے چلے آئے تھے اور وہ تمام پیشین گوئیاں یاد دلائیں جو ان کی کتابوں میں نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکور تھیں تا کہ وہ اسلام کے قبول کرنے میں پیش قدمی کریں اور عرب کے لوگ جو ہر بات میں بنی اسرائیل کے فیصلوں کا انتظار کیا کرتے تھے وہ بھی ان کے مسلمان ہونے سے اسلام قبول کریں۔ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے بے شمار واقعات ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ان پر بے شمار احسان ہیں، اس لیے آخر سیپارے تک ان ہی کا مسلسل بیان ہے۔

☼......☼......☼

سجدۂ تلاوت ادا کرنے کا طریقہ اور اس سے متعلق کچھ اہم مسائل

مفتی محمد سعید خان

سنن ترمذی میں آیا ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی مانگتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اکْتُبْ لِیْ بِھَا عِنْدَکَ اَجْراً وَاجْعَلْھَا لِیْ عِنْدَکَ ذُخْراً وَضَعْ عَنِّی بِھَا وِزْراً وَتَقَبَّلْھَا مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِکَ دَاوٗدَ عَلَیْہِ وَعَلٰی نَبِیِّنَا الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامَ .

ترجمہ: ''اے اللہ مجھے اس سجدے کی وجہ سے جو ثواب ملے گا، اپنے ہاں سے ضرور عنایت فرما دیجیے اور اس سجدے کی وجہ سے مجھ سے گناہوں کا بوجھ دور کر دیجیے، اور اس سجدے کو آپ قبول فرما کر، اسے میرے لیے اپنے پاس اجر کا ذخیرہ بنا دیجیے اور میرے اس سجدے کو اپنے ہاں ایسے ہی قبول فرما لیجیے جیسے کہ آپ نے اپنے بندے حضرت داؤد علیہ وعلیٰ نبینا الصلاۃ والسلام کے سجدے کو قبول فرما لیا تھا۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہ دعا مانگا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ سَجَدَ سَوَادِیْ ، وَبِکَ اٰمَنَ فُؤَادِیْ اللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ عِلْماً یَنْفَعُنِیْ وَعَمَلاً یَرْفَعُنِیْ.

ترجمہ: ''اے اللہ آپ ہی کو سجدہ کیا میرے جسم نے اور میرا دل آپ ہی پر

ایمان لایا اے اللہ مجھے وہ علم عطا فرما جو مجھے نفع بخشے اور وہ عمل عطا فرما جو میرے مقام میں بلندی کا سبب بنے۔''

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سجدۂ تلاوت میں یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا.

ترجمہ: ''ہمارا پروردگار پاک ہے اور بلاشبہ اس کا وعدہ (دوسری زندگی کا) پورا ہونے والا ہے۔''

(۳۶) امام صاحب کو سجدۂ تلاوت میں یہ دعائیں اُس وقت مانگنی چاہییں جب اس کے مقتدی فرض نماز یا نماز تراویح میں اتنے طویل سجدۂ تلاوت پر بُرا نہ مانیں، اور اگر وہ بُرا مانیں تو انہی دعاؤں کا پڑھنا، امام صاحب کے لیے درست نہیں ہوگا۔

(۳۷) انسان جب، اپنی کسی بھی نماز میں، خواہ وہ فرض ہو یا نفل، سجدۂ تلاوت ادا کرے تو تین مرتبہ تسبیحات پڑھنے کے بعد اِن تمام دعاؤں کا مانگنا مستحب ہے۔

(۳۸) اگر کوئی شخص نماز کے علاوہ تلاوت کر رہا ہو اور سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے اور پھر اُس سجدۂ تلاوت کو ادا کرے تو پھر تین مرتبہ تسبیحات اور ان دعاؤں کے بعد ہر وہ دعا جو کتاب وسنت میں آئی ہے، (عربی زبان میں) مانگ سکتا ہے۔

(۳۹) ان تمام تسبیحات اور دعاؤں کا مجموعہ یہ بنے گا۔

سُبْحٰنَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، سُبْحٰنَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، سُبْحٰنَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى.

سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ.

سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا. سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِىْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ

الْخَالِقِيْنَ. سَجَدَ وَجْهِيُ لِمَنْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ. سَجَدَ وَجْهِيُ لِمَنْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهٗ. اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيُ بِهَا عِنْدَكَ اَجْراً وَاجْعَلْهَا لِيُ عِنْدَكَ ذُخْراً وَضَعْ عَنِّي بِهَا وِزْراً وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيُ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ عَلَيْهِ وَعَلٰى نَبِيِّنَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامَ. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيُ بِهَا. اَللّٰهُمَّ حُطَّ عَنِّيُ بِهَا وِزْرًا وَاحْدُثُ لِيُ بِهَا شُكْراً وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيُ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ سَجْدَتَهٗ. سَجَدَ وَجْهِيُ مُتَعَفِّراً فِيُ التُّرَابِ لِخَالِقِيُ وَحُقَّ لَهٗ. لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيُ يَدَيْكَ. اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدَ سَوَادِيُ، وَبِكَ اٰمَنَ فُؤَادِيُ اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيُ عِلْماً يَنْفَعُنِيُ وَعَمَلاً يَرْفَعُنِيُ.

(۴۰) آیت سجدہ، لاؤڈ سپیکر سے سننے والوں پر بھی سجدۂ تلاوت واجب ہوگا۔

(۴۱) اگر ریڈیو یا ٹیلی وژن پر قاری کی آواز براہ راست سنائی جارہی ہے اور اس نے آیت سجدہ تلاوت کی تو سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا۔

(۴۲) آیت سجدہ لاؤڈ سپیکر پر پڑھی گئی لیکن سننے والوں کو آیت سجدہ کا علم ہی نہیں ہوا تو پھر ان پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔

(۴۳) ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ سے آیت سجدہ سُننے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔

(۴۴) آیت سجدہ کو لکھنے یا کمپیوٹر میں ٹائپ کرنے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

(۴۵) رمضان المبارک میں حفاظ کرام قرآن کریم کا دور کرتے ہیں اور اس دوران آیت سجدہ بار بار ایک دوسرے سے سنتے اور سناتے ہیں۔ تو جب تک ان کی مجلس یا نشست یا بیٹھک ایک رہے گی، ان پر سجدۂ تلاوت بھی ایک ہی واجب ہوگا۔

(۴۶) قرّاء حضرات بچوں کو حفظ کراتے ہیں تو بار بار آیات سجدہ پڑھنے سے اگر مجلس ایک ہو تو سجدۂ تلاوت بھی ایک ہی مرتبہ کرنا واجب ہے۔

(۴۷) ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور کسی دوسرے شخص نے آیت سجدہ پڑھی جو کہ اس نمازی نے سن لی تو اب یہ نمازی اپنی نماز مکمل کر کے، سجدہ تلاوت کرے گا۔

(۴۸) کسی شخص نے نماز پڑھتے ہوئے آیت سجدہ بلند آواز سے پڑھی اور کسی ایسے شخص نے سنی جو کہ نماز میں شامل نہیں تھا تو اس پر بھی سجدۂ تلاوت کرنا واجب ہو جائے گا۔ اُسے چاہیے کہ اس سجدۂ تلاوت کو ادا کرے۔

(۴۹) کسی آدمی پر غسل فرض تھا اور اس نے ناپاکی کی اس حالت میں آیت سجدہ پڑھی یا سنی تو اس پر سجدہ تلاوت واجب ہو گیا چاہیے کہ پاک ہونے کے بعد سجدہ تلاوت ادا کرے۔

(۵۰) (۱) حائضہ (۲) نفاس والی عورت (۳) وہ مرد جس پر غسل فرض تھا (جنبی) (۴) سمجھ دار بچہ، ان چاروں نے اگر آیت سجدہ تلاوت کر دی تو جس مرد و عورت نے، اِن چاروں میں سے کسی سے بھی، آیت سجدہ سنی تو اس سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے گا۔

(۵۱) آیت سجدۂ کا لفظ بلفظ ترجمہ کرنے سے، ترجمہ کرنے والے اور سُننے والے دونوں پر سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے گا۔

(۵۲) نماز میں، کوئی شخص بھی، خواہ امام ہو یا اپنی تنہا نماز پڑھے، جب نماز میں آیت سجدہ پڑھے تو فوراً سجدہ کرے۔ اس آیت سجدہ کے بعد زیادہ سے زیادہ دو آیات مزید پڑھی جا سکتی ہیں دو سے زیادہ آیات کا پڑھنا جائز نہیں۔

(۵۳) آیت سجدہ اگر کسی سورت کے آخر میں اس طرح سے آتی ہے کہ اس آیت سجدہ کے بعد دو مزید آیتیں پڑھ لی جائیں تو سورت بھی مکمل ہو جاتی ہے جیسے کہ پ:۱۵، سورۂ بنی اسرائیل میں آیت

سجدہ:۱۰۹ ہے اورسورت آیت:۱۱۱ پر مکمل ہوجاتی ہے۔ یا پھر سورت کے آخر پر آیت سجدہ کے بعد مزید چار آیات پڑھ لی جائیں تو سورت مکمل ہوجاتی ہے جیسے کہ پارہ:۳۰ میں سورۂ انشقاق میں آیت سجدہ:۲۱ ہے اور مزید چار آیات پڑھ لی جائیں تو آیت:۲۵ پر رکوع میں سجدے کی نیت کر کے رکوع کرلیا جائے تو بھی نماز درست ہے اور اگر کوئی امام یا شخص نماز میں ان آیات سجود پر سجدۂ تلاوت کرے اور پھر نماز کی اُسی رکعت میں دوبارہ قیام میں آ کر، اُسی سورت کی بقیہ آیات پڑھ کر، سورت مکمل کر کے، رکوع کرے، تو یہ بات زیادہ اچھی ہے، نماز دونوں صورتوں میں ہوجاتی ہے۔

(۵۴) اگر کسی شخص، نے نماز میں آیت سجدۂ تلاوت کر کے فوراً سجدہ ادا نہ کیا اور آیت سجدہ کے بعد مزید تین آیات پڑھ لیں تو اگر غلطی سے ایسے ہوگیا تو نماز کے آخر پر سجدۂ سہو کرنا ضروری ہے اور اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ نماز دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔

(۵۵) اگر کسی کو اس مسئلے (مسئلہ:۵۴) کا علم نہ ہو تو بھی نماز نہیں ہوگی۔ قضاء کرنی پڑے گی، کیونکہ مسئلے کا علم نہ ہونا کوئی دلیل نہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ ضروری مسائل کا علم حاصل کریں۔

(۵۶) امام اور ایک عام شخص جب کہ وہ اپنی نماز پڑھ رہا ہو، اس مسئلے (مسئلہ:۵۴) میں سب برابر ہیں۔

(۵۷) حائضہ یا نفاس والی عورت نے آیت سجدہ تلاوت کی یا سنی تو اس پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوا۔

(۵۸) پاگل آدمی خود آیت سجدہ پڑھے اور کوئی بھی اس آیت تلاوت کو سن لے تو کسی پر بھی سجدۂ تلاوت واجب نہ ہوگا نہ سننے والے پر اور نہ پاگل پر۔

(۵۹) چھوٹا بچہ، جو ابھی سمجھ دار نہ ہو، وہ آیت سجدہ پڑھے تو اس پر سجدۂ تلاوت واجب نہ ہوگا اور اسی طرح سننے والے پر بھی سجدۂ تلاوت واجب نہ ہوگا۔

(۶۰) جس آیت کی تلاوت سے سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے، اگر اس آیت کا ایک لفظ بھی پڑھنے سے باقی رہ جائے تو سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

(۶۱) اگر آیت سجدہ والی آیت کے بعد والی آیت کا تعلق بھی اس سجدے والی آیت سے ہو اور پھر ان دونوں آیات کی پوری تلاوت کے بعد ہی سجدۂ تلاوت واجب ہوگا۔

(۶۲) دونوں آیات کا تعلق سجدہ تلاوت سے تھا، اگر کسی نے صرف ایک آیت پڑھ لی اور پہلی آیت پر سجدہ ادا کر دیا تو یہ سجدۂ تلاوت نہ ہوگا۔

(۶۳) امام کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ظہر یا عصر کی نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کر کے ایسے سجدہ کرے کہ مقتدیوں کی نماز میں خلل واقع ہو جائے مثلاً وہ جب ظہر یا عصر کی نماز (سرّی نمازوں) میں سجدۂ تلاوت کرے گا تو وہ تکبیر کہہ کر سجدہ میں جائے گا اور لوگ اسے رکوع کی تکبیر سمجھ کر رکوع میں چلے جائیں گے۔ اب یہ امام دوبارہ تکبیر کہہ کر قیام کی طرف لوٹے گا تو مقتدی کیا کریں گے؟ اس لیے لوگوں کو پریشانی سے بچانے کے لیے حنفی فقہاء نے سرّی نمازوں (ظہر اور عصر) میں آیت سجدہ کی تلاوت کرنے سے منع کیا ہے۔

(۶۴) اگر امام فرض نماز یا نماز تراویح میں سجدۂ تلاوت کر رہا ہے تو پھر تسبیح (سبحن ربی الاعلی) سجدۂ تلاوت میں تین مرتبہ پڑھنا مناسب ہے تا کہ مقتدیوں پر گراں نہ گذرے اور اگر امام صرف ایک یا دو مرتبہ بھی یہ تسبیح پڑھ لے تو بھی سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔

(۶۵) امام صاحب نے نماز میں آیت سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد فوراً رکوع کیا اور رکوع ہی میں سجدے کی نیت کر لی تو امام کے اس رکوع ہی میں امام اور مقتدیوں سب کی طرف سے سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا۔

(۶۶) امام صاحب نے نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی۔ پھر بغیر سجدۂ تلاوت ادا کیے فوراً رکوع میں

چلا گیا اور رکوع میں جاتے وقت بھی سجدۂ تلاوت کی نیت نہیں کی بلکہ اس کے بعد جب نماز کا سجدہ آیا تو اس سجدے میں سجدۂ تلاوت کی نیت کر لی تو اب امام اور مقتدیوں سبھی کا سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔

(٦٧) امام صاحب نے آیت سجدہ کی تلاوت کی اور سجدۂ تلاوت فوراً ادا نہ کیا اور مقتدی نے امام کے پیچھے اس رکعت کے رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کر لی تو مقتدی کا سجدۂ تلاوت اس رکوع میں ادا ہو جائے گا۔

(٦٨) امام صاحب نے نماز پڑھاتے ہوئے آیت سجدہ پڑھ کر سجدۂ تلاوت کیا۔ پھر جب کھڑے ہوئے تو یہ آیت سجدہ دوبارہ پڑھ دی تو اب دوبارہ سجدۂ تلاوت نہ کریں وہ پہلی بار کا کیا ہوا، سجدۂ تلاوت ہی کافی ہے۔

(٦٩) کوئی شخص نماز میں وہ سورت تلاوت کرے جس میں آیت سجدہ آتی ہے اور جب آیت سجدہ آئے تو اُسے چھوڑ کر اس سے اگلی آیت پڑھنے لگے تا کہ اس پر سجدۂ تلاوت واجب نہ ہو یا کوئی شخص نماز کے علاوہ تلاوت کر رہا ہو تو جب آیت سجدہ آئے تو اسے چھوڑ کر اس سے اگلی آیت پڑھنے لگے تا کہ اس پر سجدہ تلاوت واجب نہ ہو تو ایسے کرنا مکروہ ہے کیونکہ کسی مومن سے یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور سجدہ کرنے سے اپنی جان چھڑائے۔

(٧٠) امام صاحب نے نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی اور کسی شخص نے وہ تلاوت سُن لی تو اُس پر سجدۂ تلاوت واجب ہو گیا، یہ سُننے والا، جس رکعت میں یہ تلاوت کی گئی اس رکعت میں تو شامل نہ ہو سکا لیکن اس رکعت سے اگلی رکعتوں میں یعنی نماز میں شامل ہو گیا تو اب اسے چاہیے کہ نماز مکمل کر کے، سلام پھیرنے کے بعد، اب اِس سجدۂ تلاوت کو ادا کرے۔

(٧١) امام صاحب نے نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی۔ ایک ایسے شخص نے اس آیت سجدہ کو سنا جو کہ امام صاحب کے ساتھ نماز کی اس رکعت میں شامل نہیں تھا اور بعد میں آ کر اسی رکعت میں شامل ہو گیا تو

اسکا سجدۂ تلاوت بھی ادا ہو گیا۔

(۴۲) اگر کوئی شخص تمام سورتوں میں سے صرف آیات سجدہ ہی کی تلاوت کرے تو یہ مکروہ اور ناپسندیدہ نہیں ہے۔

ایک اہم بات

(۴۳) زندگی میں کئی مرتبہ تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی دعا جلد قبول ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ پاک صاف ہو کر، وضو کر کے بیٹھے اور قرآن کریم کی وہ ۱۴ آیات جن کے پڑھنے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے۔ان تمام آیات کی اس ایک ہی مجلس یا نشست یا بیٹھک میں تلاوت کرے اور پھر ۱۴ مرتبہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرے اور یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک آیت سجدہ پڑھتا جائے اور ایک ایک سجدہ کرتا جائے۔اس طرح بھی اس کے سجدے چودہ ہی رہیں گے۔ پھر ان چودہ سجدوں کے بعد بیٹھ کر اطمینان سے دعا مانگے امید ہے اللہ تعالیٰ اس کا مقصد پورا فرما دے گا اس کی مشکلات حل ہو جائیں گی اور ہر وہ مصیبت جس کی وجہ سے پریشان ہے، حل ہو جائے گی۔ ہم یہاں پر یہ چودہ آیات مع ترجمہ اکٹھی ہی لکھ رہے ہیں تا کہ کسی نے یہ عمل کرنا ہو تو اسے قرآن کریم میں ان آیات کو ڈھونڈنے کی زحمت کا بھی سامنا نہ کرنا پڑے۔

والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات

☆......☆......☆

مقصد تخلیق

مولانا محمد خان شیرانی
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے، اس حوالے سے علماء کے تین طبقے ہیں۔

۱۔ بعض علماء کی نظر آیت ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً، البقرہ: ۳۰﴾ وغیرہ آیات پر ہے۔ لہٰذا ان علماء کی رائے میں انسانی تخلیق کا اصل مقصد خلافت ہے۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی تفسیر ہے کہ خلیفہ سے مراد خلیفۃ اللہ ہے۔ لہٰذا ان علماء کے ہاں اہمیت سیاسی عمل کو حاصل ہے۔ ذاتی اصلاح کو یا تو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے، یا پھر ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

۲۔ بعض دوسرے علماء کی نظر میں آیت کریمہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ، الذاریات ۵۶﴾ پر رہی ہے اور ان کی رائے میں انسانی تخلیق کا مقصد عبدیت (ذاتی اصلاح) ہے۔ خلافت (سیاسی عمل) کو یا تو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے، یا پھر اسے ثانوی حیثیت اس کو حاصل ہے۔

۳۔ تیسرا طبقہ علماء کا ایسا ہے کہ ان دونوں آراء پر شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ اول رائے میں یہ شبہ کہ خلافت بمعنی اجتماعی اصلاح مراد لینا اور سیاسی عمل کو اہمیت دے کر عبدیت یعنی ذاتی اصلاح کو نظر انداز کرنا یا ثانوی حیثیت دینا، اس لیے مناسب نہیں ہے کہ نبی ﷺ فرماتے ہیں:

" بنی الاسلام علی خمس ، شهادة ان لا اله لا اللّٰه و ان محمدا عبده ورسوله واقام الصلوه وایتاء الزکاة وحج البیت وصوم رمضان"

(صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، حدیث:۱۱۳)

اس کا معنی یہ ہے کہ پُر اُمن اجتماعی اصلاح جو اللہ جل جلالہ کی ہدایات اور نبی ﷺ کی سنت کے مطابق

ہو، اسی صورت میں ممکن ہے کہ کم از کم اس کے بااختیار لوگ ذاتی اصلاح کے حامل ہوں اوران کا ذاتی کردار، عبدیت کا ہو یعنی اللہ اور رسول کی کامل تعظیم و کامل اطاعت کی صفت سے متصف ہوں۔ کیونکہ اسلام بمعنی سلم یعنی امن ہو یا بمعنی تسلیم یعنی سپردگی، دونوں صورتوں میں مفہوم یہ نکلتا ہے کہ امن کی حامل مجمع یا اجتماع، جس نے سب کچھ اللہ اور رسول کے سپرد کیا ہو اور اس کا کوئی بھی عمل اور تصرف اللہ کی ہدایات اور نبی ﷺ کی سنت کے خلاف نہ ہو، اسی صورت میں ممکن ہے جب مجتمع افراد میں یہ پانچ چیزیں موجود ہوں جن کا تعلق عبدیت یعنی ذاتی اصلاح سے ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چھت دیواروں یا ستونوں پر قائم ہے۔ معنی یہ کہ صرف دیواریں یا ستون تعمیر نہیں کہلاتے اور نہ ہی موسمی تغیرات سے بچاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ نہ ہی کسی ٹیک کے بغیر چھت کا کھڑا کرنا ممکن ہے۔ لہذا جیسا کہ ہر تعمیر میں چھت اور اس کے ٹیک چاہے دیواروں کی صورت میں ہوں یا ستونوں کے، ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح خلافت بمعنی اجتماعی اصلاح یعنی سیاسی عمل اور عبدیت یعنی افراد کی ذاتی اصلاح، الٰہی ہدایات اور نبی ﷺ کی سنت کے مطابق بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ذاتی اصلاح (عبدیت) بغیر اجتماعی زندگی کے، کامل اصلاح نہیں ہوسکتی اور اجتماع کی اصلاح بغیر ذاتی اصلاح کے ممکن نہیں۔ اسی لیے ایک موقع پر نبی ﷺ فرماتے ہیں۔ رجعنا من الجھاد الاصغر (یعنی طاغوت اور ظالم قوت کے ساتھ حق کے لیے جنگ کرنے کے عمل سے) الی الجھاد الاکبر (یعنی اپنے آپ کو اندرونی کیفیات اور ظاہری اعمال میں خود پسندی، خودغرضی، مفاد پرستی غرضیکہ ذاتی زندگی میں نفس کے ہر قسم کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کی جنگ، جس کو تزکیہ نفس کہتے ہیں) یعنی ہم پہلے جہاد سے جو چھوٹا تھا دوسرے بڑے جہاد جو نفس کے ساتھ ہے، لوٹ آئے ہیں۔ ظاہر بات ہے جب تک مجاہدین کی وہ جماعت جو طاغوت کے ساتھ مصروف جنگ ہے۔ اپنی ذات کے اندر نفس کے تسلط سے آزاد اور اللہ اور رسول کی عبدیت کی صفت سے متصف نہ ہوگی وہ اس جنگ کے ذریعے سے شاید ظالم کو بدل

دیں۔مگر ظلم کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔اس لیے کہ یہ جماعت خود اپنے نفس کے تسلط سے آزاد نہیں اور نہ ہی عبدیت کی صفت سے متصف ہے۔تو وہ اگر اس جنگ کے ذریعے کسی اجتماع کو مسلط طاغوت سے نجات بھی دلا دیں۔تو یہ نئے طاغوت کی شکل میں اس اجتماع پر خود،مسلط ہوں گے۔لہٰذا اجتماع آزادی کی نعمت سے دور ہونے کی بجائے نئے طاغوت کی غلامی میں جکڑا جائے گا اور بہت ممکن کہ نیا طاغوت پرانے کی نسبت زیادہ خطرناک اور ظالم ثابت ہو۔لہٰذا مشہور کہاوت کے مطابق بکری کے لیے کیا فرق ہے کہ اگر اسے کتا بھیڑیئے سے چھڑائے اور پھر اسے خود کھا جائے۔

معلوم ہوا کہ مجمع کو طاغوت سے نجات دلانے اور اللہ و رسول کی اطاعت میں لانے کے عمل میں مصروف قوت و جماعت کے لیے لازم ہے کہ وہ اس کے علمبردار افراد اپنی ذاتی زندگی میں اندرونی احساسات و میلانات اور ظاہری کردار و عمل کے میدان میں نفس کے ہر قسم کے تسلط سے آزاد ہوں۔وگرنہ اگر یہ جماعت دعوت و سیاست کے میدان میں ہے تو اس کی دعوت و سیاست ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ نہیں بلکہ نفرت کا ذریعہ بنے گا اور اگر حکومت اور جہاد کے میدان میں رہے تو یہ حکومت اور جہاد ظلم کے خاتمے کا نہیں بلکہ پرانے طاغوت کے بدلنے اور نئے طاغوت کے مسلط ہونے کا ذریعہ بنے گا۔

جن علماء کی نظر عبدیت کی آیت پر ہے اس میں یوں اشتباہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس آیت کا مقصد اگر ذاتی اصلاح ہے تو پھر آیت میں جن اور انس دونوں کا مقصد تخلیق بیان کیا گیا ہے۔اگر دونوں کا مقصد تخلیق ایک ہے تو دونوں فضیلت میں برابر ہونے چاہئیں جب کہ علماء کرام فرماتے ہیں کہ انس کو جن پر فضیلت ہے تو وہ فضیلت کس چیز میں؟

بلکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت افراد کی ذاتی اصلاح کی بنیاد پر صالح اجتماع کی تشکیل کے لیے تھی۔جیسا کہ کمپنی جہاں ایجاد کردہ مشین کے لیے پرزے بناتی ہے وہاں ان پرزوں کو باہم جوڑ کر ایک واحد شکل بھی دیتی ہے،تب پھر کمپنی کا یہ پورا عمل کارآمد ثابت ہوتا ہے۔لہذا پرزوں کی صالح بناوٹ اور ان کے

جوڑنے سے مشین کی تکمیل ہوتی ہے اور مشین کے مکمل ہونے سے ہر ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ یہی کیفیت صالح جماعت اور اس کے صالح افراد کی ہے اور نبی ہو یا امام جہاں دعوت علیٰ وجہ البصیرت کے ذریعے عبدیت کی بنیاد پر صالح افراد کے تیار کرنے کے عمل میں مصروف ہوتا ہے وہاں ان صالح افراد سے ایک مجمع کی تشکیل کلی کی دعوت کا عمل بھی جاری رکھتا ہے تو گویا عبدیت اور خلافت کے دعوت و عمل کو ایک ساتھ جاری رکھنا ہی انبیاء علیہم السلام کا مشن تھا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور ان کی دعوت و عمل رہنمائی اور سیرت وسنت سے عبدیت اور خلافت دونوں کی تکمیل ہو چکی ہے اس لیے وہ نبی بھی تھے، امام بھی تھے اور خلیفہ بھی۔

موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اگرچہ بنی اسرائیل کو فرعون کے استبداد، ظلم اور تسلط سے نجات دلانا تھا لیکن سب سے پہلا حکم یہ ہوتا ہے کہ ﴿اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ، طٰهٰ:۲۴﴾ سیدھا فرعون کے پاس جا اس کی حاکمیت اور سیاست تمام خرابیوں اور فساد و سرکشی اور بغاوت کی جڑ ہے۔تو موسیٰ علیہ السلام نے جہاں دعوت کے ذریعے بنی اسرائیل کو الٰہی عبدیت کی جانب راغب کرنے کی جدوجہد کی وہاں طاغوت اور اس کے تشکیل کردہ طاغوتی اجتماعیت کی اصلاح کے لیے بھی جدوجہد جاری رکھی۔لہٰذا عبدیت وخلافت (سیاست) دونوں کے لیے دعوت وعمل جاری رکھا۔

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کے اور ان کی قوموں کے درمیان اختلاف اور محاذ آرائی عبدیت یعنی اپنی ذات کو الٰہی ہدایات کے تابع بنانے کے میدان میں تھی۔ یا سیاست وخلافت یعنی ایک صالح اجتماع کی تشکیل اور اس کی رہبری اور نگرانی پر تھی۔

موسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم کہتی ہے: ﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ، یونس :۷۸﴾ کیا تم اسی لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس طرز زندگی پر ہم نے آباء واجداد کو پایا ہے اس سے ہمارے رخ موڑ کر اپنے پیچھے لگا دو تا

کہ اس خطہ زمین پر حاکمیت تم دونوں بھائیوں کی ہو۔ہم کسی بھی صورت میں تمہاری اس حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے ۔شعیب علیہ السلام سے قوم نے کہا ﴿قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُاط اِنَّکَ لَاَ نْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ،ھود :۸۷ ﴾یعنی کیا تمہاری خدا پرستی تمہیں یہی بتاتی ہے کہ ہمارے آباء واجداد جن کی تعظیم واطاعت کرتے تھے،ان سے یکسر دستبردار ہو کر چھوڑ دیں اور تمہارے پیچھے ایسے لگ جائیں کہ ہمیں اپنے مال میں بھی اپنی مرضی کا تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں رہنمائی آپ سے لیں اور تعظیم واطاعت آپ کی کریں۔ یہ تو ہم تم کو بڑا نیک اور پارسا سمجھ رہے تھے تم نے بھی تسلط حاصل کرنے کی ٹھان لی ہے۔

جب ابو طالب مرض موت میں مبتلا ہوئے تو سردارانِ قریش نے طے کیا کہ ابو طالب کے پاس چلتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ اپنے بھتیجے اور ہمارے درمیان تصفیہ کرادو۔قریش میں یہی ایک شخص ہے کہ یہ تصفیہ کرا سکتا ہے اگر یہ نہ رہا تو یہ تصفیہ کبھی بھی نہ ہوگا۔اس شخص کے دونوں طرف روابط ہیں ہم سے عقیدے کا اوران سے رشتے اور تعاون کا ، لہٰذا ہم دونوں اس پر اعتماد کرتے ہیں ۔ابوجہل سمیت سردارانِ قریش ابو طالب کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ بھتیجے کے ساتھ ہمارا تصفیہ کرادو ہم تمام سردارانِ قریش اس اکیلے شخص کو اپنا ہم پلہ تسلیم کرتے ہیں ۔لہٰذا انفرادی زندگی ہم اس کے حوالے کرتے ہیں ۔ بیشک ایک خدا کا عقیدہ رکھے عبادت اور نذرونیاز ایک خدا کے لیے دے،عبادت وسجدہ ایک خدا کو کرے اور لوگوں کو بھی دعوت دے ۔لیکن اجتماعی معاملات ہم پر چھوڑ دے ۔زندگی کے دو شعبوں میں سے ایک شعبہ انفرادی زندگی کا اس کے حوالے ہوگا اور دوسرا شعبہ اجتماعی زندگی کی رہبری اور نگرانی اور اس پر غلبہ اور بالادستی ہم پہ چھوڑے۔راستے دو ہو جائیں گے ذاتی زندگی کی تشکیل اس کے حوالے اور اجتماعی زندگی کی سرپرستی ہمارے حوالے ہوگی ۔لہٰذا نہ ہم اس کے راستے اور دعوت کی روک بنیں گے اور نہ وہ ہماری سربراہی کا خطرہ۔

ابو طالب نے نبی ﷺ کو بلا کر کہا کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اگر قوم کے تمام سربراہان آپ کو اپنا مساوی تسلیم کر کے آدھا حصہ زندگی کا آپ کے حوالہ کرتے ہیں تو آپ کو یہ فیصلہ تسلیم کرنا چاہیے۔

نبی ﷺ نے ابو جہل کو مخاطب کر کے فرمایا کیا میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتاؤں کہ اگر تم لوگ میری اس بات کو مانو گے تو تمام عرب پر تمہارا اقتدار رہے گا ہی، بلکہ عجم بھی تمہارے اقتدار کے تابع ہو کر تمہیں قوت بخشیں گے۔ ابو جہل نے کہا اس قسم کے دس کلمے بتادو۔ نبی ﷺ نے فرمایا بولو "لا الـٰه الا اللّٰه" سرداران قریش سمجھ رہے تھے کہ الٰہ کا معنی حاکم ہے تو ہم اس اللہ کے محکوم ہوں گے جس کی پیغام رسانی کا دعویٰ محمد ﷺ کرتے ہیں۔ یا "الٰہ" بمعنی مالک ہے تو ہم اس کا مال ہوں گے، غلام ہوں گے۔ یا بمعنی معبود ہے تو ہم اس کی تعظیم واطاعت کے پابند ہوں گے۔ اگر ہم نے یہ وعدہ کیا تو محمد ﷺ کے اللہ کی تو نہ ہمیں جگہ معلوم ہے نہ ان کی ذات سے واقف ہیں، نہ براہ راست ہماری نشست اور گفتگو ان سے ہوسکتی ہے تو یہی ہوگا کہ محمد ﷺ ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں ہدایات دیں گے۔ نسبت اللہ سے کریں گے اور ہم ان ہدایات کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہوں گے۔ گویا عملاً ہم سب محمد ﷺ کے محکوم وغلام ہوں گے اور اس کی تعظیم واطاعت کے پابند ہوں گے۔ لہٰذا نام خدا پرستی کا ہوگا اور کام حاکمیت اور بالادستی کا لیا جائے گا اس لیے سرداران قریش کہنے لگے ﴿ان هذا الشیء یراد، ص:٦﴾ یعنی اب تو بالکل واضح ہوا کہ اس پوری جدو جہد سے مقصد اقتدار و بالادستی قائم کرنا ہے جو ہم پہلے کہا کرتے تھے کہ یہ شخص اقتدار کا طالب ہے۔ آج بھی اگر دین وشریعت کے حوالے سے اقتدار و حاکمیت پر انگلی اٹھائی جائے تو ذاتی معاملات میں شرعی ہدایات کی پابندی کرنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ جس دعوت میں شرعی اصول ہدایات کی روشنی میں اقتدار و حاکمیت پر حرف گیری ہو تو مستبد قوتیں سٹپٹا جاتی ہیں تو جب دعوت علیٰ منہاج النبوت ہو تو اس میں ذاتی زندگی کی اصلاح اور صالح اجتماع کی تشکیل دونوں کے لیے دعوت وعمل ساتھ ساتھ جاری رہے گا اور وہی قوتیں ابتدائی طور پر

مقابلے میں رہیں گے جو انبیاء کے مقابلے میں رہی ہیں ۔ اگرچہ بعد میں مقابل قوتیں بھی نبی ﷺ کا ساتھ دینے لگیں ۔ سورہ بقرہ کے ابتداء کے دورکوعات میں نبی ﷺ کی دعوت کے مخاطبین کی تقسیم بیان کی گئی ہے کہ مخاطبین میں کچھ وہ لوگ ہوں گے جن کو آپ کی ذات پر مکمل اعتماد ہوگا اور آپ کی دعوت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کریں گے ۔ یہ ہیں مومن یعنی کامل اعتماد کرنے والے ۔ دوسرا وہ طبقہ ہوگا جو نہ تو کھل کر آپ کی ذات پر اعتماد کریں گے اور نہ ہی آپ کی دعوت کو تسلیم کریں گے ۔ یہ ہیں کافر یعنی نہ ماننے والے ۔ اور ایک تیسرا طبقہ ہوگا کہ خود غرض اور مفاد پرست ہوگا ۔ اس کو منافق کہتے ہیں، یعنی ان کی کسی بات پر کوئی اعتماد نہیں ہوگا ۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱ سے ۲۹ تک نزول وحی کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ نزول وحی کا مقصد انسانی فرد اور اجتماع کی حفاظت اور اس مقصد کے حصول کا راستہ عبدیت یعنی اللہ و رسول کی کامل تعظیم اور ان کی ہدایات کی کامل اطاعت واحد راستہ ہے ۔ انسانی فرد اور اجتماع کے ہر قسم کے مصائب مشکلات اور نقصانات و پریشانیوں سے حفاظت کا ۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ میں انسانی تخلیق کی عظمت، افادیت اور مقصد بتایا گیا ہے کہ خلافت ہے ۔ ابن عباس ؓ کی تفسیری روایت کے مطابق خلیفہ کا معنی خلیفۃ اللہ ہے ۔ ملائکہ کے استفسار سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ نئی مخلوق اللہ کا خلیفہ ہوگی تو مخلوق میں تعدد ہوگا اور اللہ کی صفات میں نمایاں صفات دو ہیں ۔ ۱۔ اختیار، ۲۔ اقتدار، تو گویا خلافت کی بنیاد پر ہر فرد بشر اختیار کا مالک بھی ہوگا اور اقتدار کی صلاحیت بھی رکھتا ہوگا تو ایسی صورت میں حصول اقتدار کی دوڑ میں تصادم ہوگا ۔ آبادیاں اجڑیں گی اور خون بہے گا ۔

سابقہ بحث سے شاید یہ بات واضح ہو چکی ہو کہ انسانی تخلیق کا مقصد خلافت لینا اور سیاسی عمل کو اوّلیت دینا اور ذاتی اصلاح سے صرف نظر کرنا ۔ یا انسانی تخلیق کا مقصد عبدیت لینا اور صرف ذاتی اصلاح پر نظر مرکوز کرنا اور سیاسی عمل یعنی اجتماعی اصلاح کی دعوت و عمل سے صرف نظر کرنا دونوں رائے اشتباہات

سے خالی نہیں ہیں۔

خلافت اور عبدیت لغوی مفاہیم کے اعتبار سے اگر چہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔لیکن عملی تطبیق اور خارجی مصداق کے اعتبار سے ایک ہیں۔ذاتی زندگی میں انسان کے پاس دو چیزوں کا نقد سرمایہ ہے۔ایک جان، یعنی سر سے لے کر پاؤں تک انسانی صلاحیتیں۔مثلاً دل و دماغ سے سوچنا اور منصوبہ بندی کرتا ہے۔کانوں سے سننا، آنکھوں سے دیکھنا، زبان سے بولنا وغیرہ وغیرہ۔اور دوسری چیز مالی وسائل ہیں۔ان دونوں کو انسان اپنے تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، معاشی اور تمدنی میدانوں میں استعمال کرتا ہے اور اس استعمال کے بدلے میں کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔جن چیزوں کو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے ان کے تعین کے لیے انسان کے پاس دو ذریعے ہیں۔ایک نفس جس کی چاہت اور انتخاب کا تعلق ظاہر اور مادی اور دنیاوی مفادات، خواہشات، لذائذ سے ہے۔اور دوسرا عقل جس کے انتخاب اور خواہش اور طلب کا مدار دلیل، حجت، برہان اور بصیرت پر ہے۔اب اگر انسان اپنی شخصی زندگی میں اللہ کا خلیفہ ہوگا تو وہ جان اور مال کے سرمائے کا نفس سے دفاع کرے گا۔عقل و دلیل کے راستے سے وحی کی روشنی میں اپنی جان اور مال پر مسلط اور حاکم ہوگا۔اس طرح زندگی میں انسان خلیفہ ہے۔اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اپنے اندر اللہ کی حاکمیت قائم کی ہے، اپنی جان اور مال کو نفس کے تسلط سے آزاد کیا ہے، جو جہاد ہے۔اور دلیل کے راستے سے وحی کی روشنی اور حدود اربعہ میں عقل کو اپنی جان اور مال پر مسلط کر کے حکم کیا ہے جو خلافت ہے، اور عہد ہے اس لیے کہ وہ اپنی جان اور مال کو اللہ کی تعظیم واطاعت میں اور نبی ﷺ کی سیرت اور سنت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔عبدیت اسی تعظیم واطاعت کا نام ہے۔لہٰذا ایسی صورت میں انسان اپنی ذاتی زندگی میں خلیفۃ اللہ بھی ہے اور عبداللہ بھی۔لیکن عبدیت کا پہلو نمایاں ہے سب دنیا کو نظر آتا ہے کہ یہ شخص اپنی جان اور مال کو اللہ اور رسول کی اطاعت و تعظیم میں استعمال کرتا ہے۔لیکن ذات پر اس کی حاکمیت کا پہلو نظر نہیں آتا۔اس لیے انسان کی ذاتی زندگی کے میدان میں خلافت سے تعبیر عبدیت سے کی جائے گی۔اور جب یہی شخص اپنی جان اور مال کو اللہ اور رسول کی اطاعت و تعظیم میں

استعمال کرتا ہے لیکن ذات پر اس کی حاکمیت کا پہلو نظر نہیں آتا۔اس لیے انسان کی ذاتی زندگی کے میدان میں خلافت کی تعبیر عبدیت سے کی جائے گی۔اور جب یہی شخص دعوت کے میدان میں امامت کے مرحلے سے گزر کر عام پبلک کے اعتماد اور رضامندی کے نتیجے میں خلافت کے منصب پر فائز ہوتا ہے اور ایک اجتماع کو تشکیل دیتا ہے تو وہ اس اجتماعیت سے دفاع بھی کرتا ہے، جو جہاد ہے۔اور اس پر اللہ کی حاکمیت بھی قائم کرتا ہے، جو خلافت ہے۔اور اجتماع کی تمام صلاحیتوں اور وسائل کو اللہ اور رسول کی اطاعت میں استعمال کرتا ہے، جو عبدیت ہے، لیکن جامعیت پر حاکمیت کی صورت میں خلافت کا پہلو (یعنی حاکمیت) نمایاں ہے ۔اور اس مجموعے کا، جو ایک اعتباری فرد ہے، اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو اللہ اور رسول کی تعظیم واطاعت میں استعمال کرنے کا عمل ہے جو عبدیت ہے اتنا ظاہر نہیں۔لہٰذا اس مرحلہ میں عبدیت سے تعبیر خلافت کی جائے گی۔گویا کہ ذاتی اور شخصی زندگی میں خلافت سے تعبیر عبدیت سے کی جائے گی اور اجتماعی زندگی میں عبدیت سے تعبیر خلافت سے کی جائے گی۔اگرچہ دونوں مراحل میں دونوں صفات موجود ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ:

۱۔ انسانی تخلیق کی حکمت، افادیت اور مقصد خلافت ہے۔

۲۔ محفوظ راستہ شخصی اور اجتماعی زندگی کا اللہ کی عبدیت اور رسول کی اطاعت ہے۔جو ابتداء میں حصول خلافت اور بعد میں بقائے خلافت کا ذریعہ ہے۔

۳۔ بنیادی فریضہ جہاد ہے، شخصی زندگی میں جان اور مال کو نفس کے تسلط سے آزاد کرنا اور دلیل کے راستے سے وحی کی روشنی میں جان اور مال پر عقل کو حاکم اور مسلط کرانا اور اجتماعی زندگی میں اس صالح اجتماع کو ضرر رساں اور محارب قوتوں سے بچانا اور اللہ اور رسول کی اطاعت میں چلا کر الٰہی خلافت قائم کرنا۔

۴۔ بنیادی ضرورت جماعت ہے۔جس کی ابتداء نصب امام سے ہوتی ہے۔

☼......☼......☼

کشکول

مفتی محمد سعید خان

ناغہ

ابن رشد کا شمار، آئمہ فلسفہ میں ہوتا ہے۔ان کا اصل نام محمد بن احمد تھا اور ان کے دادا کا نام بھی محمد بن احمد تھا۔ پوتے کو دادا سے ممتاز کرنے کے لیے، ابن رشد الحفید ،لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ان (ابن رشد الحفید) کی پیدائش ۵۲۰ھ میں ہوئی اور پچھتر برس کی عمر ۵۹۵ھ میں انتقال کر گئے۔عمر بھر مطالعہ جاری رہا اور روایات میں آتا ہے کہ ان کی پوری زندگی میں صرف دو راتیں ایسی تھیں، جب مطالعہ نہیں ہوسکا۔(۱) جس رات والد صاحب کا انتقال ہوا۔(۲) شادی کی رات۔(الدیباج المذھب، رقم: ۷۷، محمد بن احمد بن محمد بن احمد ابن احمد، الرشد الشہیر بالحفید، ج:۲،ص:۲۰۲)

آسان اور دشوار

سلطان جہاں حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ جب شہزادے اور بھر پور جوان تھے، دکن کی نظامت ان کے سپرد کی گئی۔ چھٹیوں کے چند دن اپنی خالہ (زوجہ خانِ زماں) کے گذارنے، برہان پور گئے۔ایک دن اپنی اس خالہ کے باغ میں گئے تو انکی کنیز ہیرابائی عرف زین آبادی، آم توڑ رہی تھی۔اس کی آم توڑنے کی ادا، کم سنی اور حسن و جمال نے اتنا متاثر کیا کہ یہ اپنا دل ایک نگاہ ہی میں ہار بیٹھے۔ تعارف جب مزید بڑھا تو معلوم ہوا کہ اس کی سیرت،صورت سے زیادہ دلکش ہے۔آواز میں وہ لوچ تھا کہ جب اس نے غزلیں سنانی شروع کیں، تو ناظمِ دکن کے اندر کی دنیا، ہزار جان سے قربان ہوئی۔

زین آبادی خود کلام کا انتخاب کرتی اور سناتی رہی ۔نشاط وانبساط کا یہ دور چند دن چلا اور پھر وہ ہوا جو قدرت کو منظور تھا۔اورنگ زیب عالمگیر اس کی محبت میں گرفتار ہوئے اور اچانک اس خاتون کا انتقال ہوگیا۔موت کیا تھی ،اورنگ زیب کے دل کی دنیا اُجڑ گئی ۔اس اچانک حادثے نے کہرام بر پا کر دیا اور آداب شہزادگی ونظامت دکن اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے کہ اس غم کا برَملا اظہار کیا جائے۔ حکم دیا کہ شکار کا سامان رکھا جائے۔تعمیل ہوئی اور کوچ ہوا۔شکار تو محض بہانہ تھا اور حقیقت یہ تھی کہ زین آبادی کی اچانک موت کا غم اور صدمہ اپنے اظہار کے لیے جن تنہائیوں کا متقاضی تھا، وہ تنہائی فراہم ہو۔آنسو بہیں لیکن دیکھنے والا کوئی نہ ہو،فریاد نکلے لیکن کوئی سننے نہ پائے۔ماتم بپا ہو اور تنہائی ہو۔

عاقل خان رازی ، جو اورنگ زیب کے مزاج واداشناس تھے، یہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہے تھے، شکار میں جب تنہائی ملی تو پوچھا شہزادے اتنے شدید غم کی حالت میں، سیر وشکار کے لیے نکلنے کے کیا معنی ؟

اورنگ زیب نے صرف ایک شعر میں ساری حقیقت بیان کردی فرمایا:

ے نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

گھر میں رہ کر، نالہ وفریاد کرنے سے دل کی تسلی نہیں ہوتی ۔جنگل اور ویرانے اس مقصد کے لیے، منتخب کرنے چاہئیں۔

عاقل خان رازی نہایت دانا اور برموقع بات کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جواباً اس نے بھی ایک شعر پڑھا:

ے عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود ، یار چہ آساں گرفت

عشق کتنی آسانی سے ہوگیا تھا لیکن اب آہ بھرنا بھی کتنا دشوار ہے۔محبوب کی جدائی کتنی مشکل تھی لیکن اس

نے کتنی آسانی سے اس مرحلے کو طے کرلیا۔

زین آبادی کی جدائی اور اس شعر کی چولیں اپنی جگہ پر درست بیٹھیں۔ اورنگ زیب پر رقت طاری ہوگئی بے اختیار روتا رہا اور بار بار یہی شعر پڑھتا رہا۔

جیسا کہ تقدیر میں لکھا تھا، اس مرحلے نے طے ہونا تھا، سو وہ طے ہوگیا لیکن قدرت نے اورنگ زیب کو سمجھا دیا کہ وہ جس بڑے مقصد کے لیے تیار کیے جا رہے ہیں، اس مقصد کی راہ میں کئی مرتبہ غم کی بھٹی میں جلایا جاتا ہے اور تربیت کے مراحل میں رنج اور دُکھ سہنے کی ہمت ایسے ہی پیدا کی جاتی ہے۔

یا پھر یہ کہ انہوں نے آئندہ زندگی میں جو عظیم الشان کام انجام دینے ہیں، ایسے بے مثل قائد کو ان کاموں کی طرف توجہ کرنی چاہیے نہ یہ کہ اس سے کم درجے کی زندگی پر اکتفاء کرلیا جائے۔

(ماثر الامراء، ج:۱، ص:۵۴۲۔۵۴۳)

جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا
وہ چنگاری خس وخاشاک سے کس طرح دب جائے

وحدانیت اسم و مُسَمّٰی

علمِ کلام کی دقیق ترین مباحث میں سے ایک بحث یہ بھی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام اور اس کی ذات ایک ہستی ہیں یا دونوں الگ الگ ہیں؟ اہل بدعت کا کہنا یہ تھا کہ اللہ، رحمٰن، رحیم وغیرہ یہ نام ہیں اور ذات باری تعالیٰ ان سے الگ ہے جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مؤقف یہ ہے کہ جس کا نام اللہ یا رحمٰن ہے وہی اللہ اور رحمٰن ہے۔ اسم اور مسمیٰ دونوں ایک ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مسلک ذکر کیا ہے۔

وهذا هو الذي اراده من قال من اهل السنة: ان الاسم هو المسمى. ارادوا به ان الاسم إذا دعى و ذكر يراد به المسمى. فاذا قال المصلي

اہل السنۃ والجماعۃ میں سے جس نے بھی (مذکوہ بالا بحث کا) اعتراف کیا ہے، یہی ہے کہ اسم ہی مسمیٰ ہے۔ اور اس جملے سے ان کی مراد یہ ہے کہ جب بھی

(اللہ اکبر) فقد ذکر اسم ربه ، و مراده المسمی.
(مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام أحمد بن تیمیه رحمة اللّٰه علیه، مراد من قال السلف الاسم هو المسمیٰ، ج:١٦،ص:٣٢٣)

اللہ تعالیٰ کا ذکر کسی نام کو جَپ کر کیا جاتا ہے یا اس کا کوئی نام لے کر دعا مانگی جاتی ہے تو اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ہستی ہی ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے والا جب ''اللہ اکبر'' کہتا ہے تو وہ اپنے رب کا نام (اللہ) بول کر اس (اللہ) کی ذات ہی مراد لیتا ہے۔

کعبۃ اللہ کی غلاف پوشی

قطع نظر اس بحث کے کہ حضرات اولیاء کرام رحمہم اللہ کی قبور پر چادریں چڑھانا اور یہ غلاف پوشی جائز ہے یا نہیں؟ اس بات پر کسی بھی فرقے کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ بیت اللہ پر غلاف چڑھانا نہ صرف جائز بلکہ ایسا کام ہے جو دلائل شرعیہ سے ثابت اور بہترین نیکی ہے۔ مزارات پر چادریں چڑھانے اور بیت اللہ پر غلاف کے عمل کو ایک دوسرے سے دور دور کی بھی کوئی نسبت نہیں ہے لیکن اسلاف کرام رحمہم اللہ بیت اللہ پر غلاف چڑھانے سے زیادہ ضروری یہ سمجھتے تھے کہ بھوکے اور ضرورت مند لوگوں کو ان کی ضروریات زندگی مہیا کی جائیں۔ اس باب میں ان کے ہاں اتنی وسعت تھی کہ خلیفۂ زاہد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو کعبۃ اللہ کے خدام نے خط لکھا کہ بیت اللہ پر غلاف چڑھانے کے لیے وہ احکامات جاری کریں، جیسے کہ ان سے پہلے اموی خلفاء بیت اللہ پر غلاف چڑھانے کے لیے رقم دیا کرتے تھے یا پھر غلاف کی تیاری کے احکامات جاری کیا کرتے تھے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بیت اللہ کے خدام کو جوابی خط میں تحریر فرمایا:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ جتنا خرچ بیت اللہ کے غلاف کی تیاری پر اُٹھے گا اگر وہی رقم میں لوگوں کی بھوک ختم کرنے پر خرچ کر دوں، تو یہ زیادہ ثواب کی بات ہے۔''[1]

[1] عن نوفل بن أبی الفرات [قال : کتبت الحجبة الی عمر بن عبدالعزیز، یأمر للبیت بکسوة کما یفعل من کان قبله، فکتب الیهم : انی رأیت أن أجعل ذلك فی أکباد جائعة فانهم أولی بذلك من البیت.(حلیة الاولیاء ، عمر بن عبدالعزیز الاموی رحمة اللّٰه علیه، ج:٥،ص:٣٠٦)

دینی حلقوں میں عدم برداشت......مضمرات ونتائج

محمد اورنگ زیب اعوان

دینی حلقوں میں عدم برداشت کی موجودہ کیفیت نئی نسل کے لیے انتہائی اضطراب کا باعث بن رہی ہے۔ بات بات پہ فتوے، تنقیدات، الزامات اور تہمتوں کی اس روش نے ذہنی ارتداد کی کیفیت کو جنم دیا ہے۔ ہمارے سنجیدہ اہل علم کو اس معاملہ میں باہم سوچ و بچار کے بعد ایسی مشترکہ پالیسی طے کرنی چاہیے جس کے باعث ایسے معاملات کی راہ روکی جاسکے۔ کوئی رائے دینے، کچھ کہنے اور لکھنے سے پہلے اس کے تمام مثبت و منفی پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہیے۔ فوائد اور نقصانات اگر مدنظر ہوں تو امید ہے کہ اختلافات کی صورتیں کم ہی پیدا ہوں گی۔ محض شخصی اور ذاتی مقاصد ومفادات کے حصول کی خاطر کسی رائے کے اظہار میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

دوسروں کو جبراً قائل کرنے کے بجائے صبراً مائل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارے اکابر اپنے اصاغر کی اصلاح اس انداز میں کریں کہ وہ محسوس کریں کہ جیسے والد اپنے بیٹے کی اصلاح کرتا ہے ایسے ہی یہ بزرگ ہماری اصلاح فرما رہے ہیں۔

تنقید اور جارحانہ اندازِ اصلاح، اصلاح کی بجائے فساد کا سبب بنتا ہے۔ ہم محض جذبات کی رو میں بہہ کر ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ہم نے کیا کر دیا ہے؟ اور جب پانی سر سے گذر جاتا ہے تو پھر سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ سانپ گذر جائے تو لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس لیے کہا جاتا ہے کہ پہلے تولو پھر بولو۔ اسی طرح لکھتے ہوئے بھی ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر لکھنا

چاہیے،تقریر سے زیادہ تحریر اثر انداز ہوتی ہے۔

اگر ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہوجائے کہ ہم نے بولے جانے والے ایک ایک کلمہ اور لکھے جانے والے ایک ایک لفظ کا اللہ رب العزت کے سامنے جواب دینا ہے تو ہماری زبان اور قلم بہت ہی محتاط ہو جائیں۔

ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ ہماری منفی تحریروں کے نقصانات کتنے زہریلے مرتب ہوتے ہیں۔ ہمارا مخالف اور مخاطب تو جواثر لے وہ تو ہے ہی مگر اس طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا کہ دین دشمن افراد اور جماعتوں کے پاس ہمارا تمام ریکارڈ محفوظ ہو رہا ہے اور وقت آنے پر وہ ہماری نسلوں کو ہم ہی سے نہیں بلکہ دین اسلام سے بدظن اور برگشتہ کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔

جیسا کہ ’’تاریخ احمدیت‘‘ لکھ کر قادیانیوں نے کیا ہے اور منکرینِ حدیث اپنی کتابوں میں کر رہے ہیں۔صرف مذہب کا سرطان۔(مرتب: کوثر جمال)،تاریک اجالے،حقیقی علماء اور جعلی علماء۔احتساب یا انقلاب،حقیقی عبادت جعلی عبادت۔(مرتب: مشتاق احمد) اور پسِ نوشت (ڈاکٹر پرویز پروازی) کا دیکھنا ہی اس حوالہ سے ہماری آنکھیں کھولنے اور غفلت کی چادر اتارنے کے لیے کافی ہوگا۔

پورے ملک میں چند گنی چنی شخصیات کے استثناء کے بعد ہمارے ہاں کون ہے جو اس نہج پر سوچ کر بولے اور لکھے؟

ہم پہلے جذبات کی رَو میں بہہ کر ایسی باتیں اور فتوے تحریر کر جاتے ہیں اور بعد میں ان کی وضاحتیں پیش پیش کرتے کرتے عمر بیت جاتی ہے۔آغاز ایک تحریر سے ہوتا ہے اور اختتام ایک کتاب پر جا کے ہوتا ہے۔کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ فتویٰ پہلے دے دیا جاتا ہے اور فریق ثانی سے متعلق دلائل وشوائد بعد میں اکٹھے کیے جاتے ہیں۔

کراچی کی ایک بہت بڑی علمی شخصیت نے ایک تنظیم کے خلاف فتویٰ تحریر فرمانے کے بعد مردان کے

ایک عقیدت مند کو تحریر کیا کہ فتویٰ تو میں نے دے دیا ہے مگر ان سے متعلق بنیادی معلومات بھی مجھے نہیں ہیں۔آپ براہ مہربانی ان سے متعلق بنیادی معلومات مجھے فراہم کریں...... ہمارے ایک انتہائی قابل احترام ''کالم نگار'' دوست نے ایک دفعہ حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ العالی سے استفسار کیا تھا کہ حضرت! ہم جب لکھتے ہیں تو بار بار کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے، تین چار دفعہ کی ریاضت کے بعد کہیں جا کے ''کالم'' مکمل ہوتا ہے جب کہ آپ کو بارہا دیکھا کہ آپ لکھنے بیٹھتے ہیں اور ایک ہی نشست میں اپنا ''کالم'' مکمل کر لیتے ہیں اور اس میں کہیں کانٹ چھانٹ بھی نہیں کرتے ،تو اس کی وجہ کیا ہے؟ مولانا زاہدالراشدی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا بھائی! آپ لکھنے کے بعد سوچتے ہیں اور میں لکھنے سے پہلے سوچتا ہوں۔دوسری طرف وہ ہیں کہ ''کالم'' ہی نہیں ''فتویٰ'' ارشاد فرمانے کے بعد سوچتے ہیں بلکہ بعض تو فتویٰ جاری کرنے کے بعد بھی نہیں سوچتے......!اناللہ وانا الیہ راجعون.

پھر نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ فریقین میں تبادلہ دلائل کا نہیں الزامات واعتراضات کا ہوتا ہے۔ اور یہ الزامات واعتراضات بھی علمی نہیں ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ہم اُسے تحریر کا حسن سمجھتے رہتے ہیں کہ جتنا کسی کی ذات پر کیچڑ اچھالیں گے اتنا ہی تحریر میں زور پڑے گا اور ادب کی چاشنی بڑھے گی ہمیں یہ احساس سرے سے نہیں ہوتا کہ ایسا کر کے ہم کسے خوش کر رہے ہیں اور ہماری ان تحریروں سے کل فائدہ کون اٹھائے گا؟

ابھی تک ہماری ماضی کی تحریروں سے ہی گلوخلاصی نہیں ہوئی ، پہلے ہی اعتراضات وجوابات کا سلسلہ تھمنے نہیں پایا کہ اب مزید نئے نئے مسائل نے جنم لینا شروع کر دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ فریقین میں عدم برداشت اور عدم حوصلہ ہے۔

ہر فرد، ہر ادارہ، ہر جماعت یہی سمجھتی ہے کہ جو ہماری رائے ہے وہی ''اقرب الی الحق'' ہے اور اب تو بات اقرب سے ہٹ کر ''عین الحق'' تک پہنچ گئی ہے کہ جو میں کہتا ہوں ، جو میرا نظریہ ہے، جو میری

سوچ ہے، جو میں لکھتا ہوں، وہی حق ہے، صحیح یہ ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ باطل، لغو اور غلط ہے۔انــا و لاغیــری ہی آج ہمارا نعرہ ہے۔اسی سوچ اور نظریے نے آج ہمیں جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

ایسے معاملات میں شیطان اور اس کے چیلے ہمارے سامنے ایسے ایسے دلائل لا کر رکھ دیتے ہیں کہ پھر ہم رکنے اور ٹھہرنے کا نام تک نہیں لیتے اور ایک دوسرے پر ایسے تابڑ توڑ حملے کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ خدارا ہمارے اکابر و معاصر اپنے اس عمل پر نظر ثانی فرمائیں اور امت کے اس بکھرے شیرازے کو مزید انتشار وافتراق کی دلدل میں نہ دھکیلیں۔ اکابر کے ساتھ ساتھ اصاغر کو بھی اس کا احساس کرنا چاہیے کہ:

موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ بھی نہیں۔

الـخیـر مع اکابر کم ، البرکۃ مع اکابرکم اور البرکۃ مع اکابرکم اھل العلم کا سنہرا اصول ہمارے سامنے رہنا چاہیے، اکابر اُمت سے جب ہم کٹیں گے تو پھر ایک آوارہ پتاّ ہی ہو کر رہ جائیں گے، ہوا جدھر چاہے گی ہمیں لے جائے گی اور چلو اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو، کا مصداق بن کر رہ جائیں گے۔پتاّ شاخ کے ساتھ جُڑا ہی اچھا لگتا ہے۔ جو پتاّ شاخ سے ٹوٹ کر گر جائے وہ پھر پاؤں تلے ہی روندا جاتا ہے۔

یہ نعرہ، یہ سوچ، یہ فکر، یہ نظریہ اور یہ انداز قطعی مناسب نہیں ہے کہ ہم کہتے پھریں، اکابر کون ہوتے ہیں؟ ہم اکابر کو نہیں مانتے......ہمیں اکابر کی راہ نہیں اپنانی......اور بعض تو اپنی تقاریر میں یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ موجودہ اکابر کی سوچ اور نظریہ ہمارے جوتے کی نوک پر............!

یہ تمام الفاظ، یہ نظریہ اور یہ سوچ ہمارے ''باغیانہ پن'' کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہماری ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری تمام تر عزت، وقار، مرتبہ اور مقام اپنے اکابر ہی کا مرہون منت ہے، اکابر ہی سے وابستگی میں ہماری بقا کا راز مضمر ہے۔ اگر ہم اپنے اکابر سے بغاوت کریں گے

اوران سے کٹ کرزندگی گذاریں گےتو پھر:

ہماری داستاں تک نہ ہو گی داستانوں میں

ہمارا مقصود یہ باور کرانا بھی نہیں ہے کہ اکابر''معصوم'' ہیں۔ان کی ہر بات کوآنکھیں بند کر کےتسلیم کرلیا جائے۔جہاں ہمیں ان کی رائے اور مؤقف سے اختلاف ہووہاں انتہائی متانت، شائستگی اور ادب واحترام کے دائرے میں رہتے ہوئے ان سے اختلاف رائے کیا جائے اوراس میں انداز جارحانہ اور گستاخانہ نہ ہو۔

جہاں کہیں کسی معاملہ میں اختلاف ہوتو آپس میں مل بیٹھ کران معاملات کوحل کر لینا چاہیے،رسائل وجرائداور کانفرنسوں میں ان اختلافات کونہیں اچھالنا چاہیے۔

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اکابر کا مؤقف ہماری رائے کے موافق نہیں اور ہماری سوچ،فہم اور دانست کے مطابق صحیح نہیں ہےاور وہ بھی اپنے مؤقف کی غلطی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تو پھر خاموشی سے ان سے علیحدگی اختیار کرلی جائے اوران اختلافات کومزید ہوا نہ دی جائے۔

ہمیں اپنی رائے منوانے پراصرار نہیں کرنا چاہیے،ہم اس کے مکلّف قطعاً نہیں ہیں کہ ڈنڈے اور گولی کے زور پراپنے مؤقف کومنوائیں، جو مانتا ہے مانے،نہیں مانتا نہ مانے۔ہمارے ذمہ صرف اتنی بات ہے کہ اپنے اس مؤقف اوررائے کی وضاحت ان کے سامنے کردیں اور بس......!

ایک دوسرے کی ذات پرکیچڑ اُچھالنے کے بجائے اگر اصلاح کا پہلو سامنے رکھا جائے تو امید ہے کہ اس کے اچھے نتائج مرتب ہوں گے اور ہم یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ ہماری اس درخواست کو درخور اعتنا سمجھا جائے گا اوراس سے بےاعتنائی نہیں برتی جائے گی۔

مندرجہ بالا گذارشات کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ گذشتہ ایک عرصہ سے ہمارے دینی طبقہ میں ایسی ہی سوچ اورنظریات پروان چڑھ رہے ہیں۔اس کا نقصان یہ ہورہا ہے کہ نئی تعلیم یافتہ نسل ہم سے

دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ وہ علمائے حق سے کٹ کر نام نہاد سکالرز سے اپنی وابستگی پر فخر کا اظہار کر رہی ہے۔ اور ....!!!!

ہمارے ایک انتہائی مہربان بزرگ اور ممتاز عالم دین جو اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، ان سے ایک طالب علم نے سوال کیا کہ سر! ہمارے علماء ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے دیتے ہیں ان میں سے ہم مسلمان کس کو کہیں گے؟

وہ فرماتے ہیں کہ میں بچے کے اس سوال کو سُن کر چونک اٹھا اور انتہائی حیرانی کے ساتھ اس بچے سے پوچھا، بیٹا! یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟ تو اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا کہ سر! ''میں نے احمدیوں (قادیانیوں) کے ٹی وی چینل پر ان کا ایک پروگرام دیکھا تھا جس میں ان کے خلیفہ مرزا مسرور احمد بتا رہے تھے کہ علماء کے فتوؤں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایک ایک کو کافر کہتا ہے تو دوسرا دوسرے کی تکفیر کرتا ہے، ساتھ ہی وہ فتویٰ کی مختلف کتابوں سے حوالہ جات بھی دِکھلا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہی مولوی جو آپس میں ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں اگر ہمیں کافر کہہ دیں تو کیا ہے، یہ تو اپنے علاوہ کسی کو مسلمان سمجھتے ہی نہیں، ان میں سے ہر کوئی اپنے مخالفین کو کافر کہنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔''

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ میں حیران رہ گیا کہ باطل کس انداز میں اپنی محنت کر رہا ہے اور اپنے کفر کو چھپانے کے لیے کیسی شاطرانہ چال چل رہا ہے اور دوسری طرف ہم ہیں کہ ایک دوسرے پر تنقید اور تکفیر ہی سے فرصت نہیں ملتی۔

کسی پر کفر کا فتویٰ تو کسی پر شرک وبدعت کا فتویٰ، کسی کے پیچھے نماز حرام تو کسی کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی......اور پورے زور وشور سے عوامی اجتماعات میں ہم ان فتوؤں کی تشہیر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی مسلک حقہ کی خدمت ہے جو ہم سرانجام دے رہے ہیں۔

اگر کوئی ہماری رائے سے اختلاف کرے یا ہمیں سمجھانے کی کوشش کرے تو ہم لٹھ لے کر اس کے پیچھے

پڑ جاتے ہیں۔کبھی اسے کافر،کبھی مشرک،کبھی مرتد،کبھی بدعتی اور کبھی ایجنسیوں کا آلہ کار کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور غیر ارادی طور پر کس کے آلہ کار بن کے ہم اس کے مشن کی تکمیل میں ہمہ وقت مصروف عمل ہیں؟

ہم یہ نہیں کہتے کہ کافر کو کافر،مشرک کو مشرک،مُرتد کو مُرتد اور بدعتی کو بدعتی نہ کہیں،ضرور کہیں،اپنے عقیدے کا اظہار ضرور کریں،مگر دوسروں کو کافر،مشرک اور بدعتی نہ بنائیں،البتہ بتائیں ضرور۔

فتویٰ کا بھی ایک معیار ہو،ہر شخص اس منصب پر فائز ہونے کے قابل اور اہل نہیں ہوتا۔منصب افتاء کے جو تقاضے ہیں فتویٰ دینے والے اس پر بھی تو پورے اُتریں......!

منصب افتاء کے تقاضے اوران کی تفصیلات کتب فقہ وافتاء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

تیقظ وبیدار مغزی،وسعت مطالعہ،صحت استنباط،مسائل جدیدہ کے حل کے لیے صفت اجتہاد اور تدیّن کا ہونا یہ سب وہ چیزیں ہیں جو فتویٰ دینے والے کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔

خدارا اسے تنقید پہ محمول نہ کیا جائے۔اب جو روش چل پڑی ہے کہ ایک سال اور دوسال میں مفتی کا کورس پڑھایا جارہا ہے اور مفتیان کرام کی ایک کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ان میں سے اکثر ہمارے حلقہ احباب میں ایسے بھی ہیں جو''بہشتی زیور''،''آپ کے مسائل اوران کا حل''،''مسائل رفعت قاسمی'' سے دیکھ کر فتویٰ دیتے ہیں۔عربی عبارات کا پڑھنا اور اصل ماٰخذ تک رسائی ان کے لیے کارِ دارد اور عبث ہے۔

پشاور میں ہمارے دوست ایک دفعہ ملنے کے لیے آئے اور فرمایا،یزید کی سن پیدائش کیا ہے؟ میں نے مسکرا کر عرض کیا مولانا صاحب!اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ فرمانے لگے میں نے اپنی جمعہ کی تقریر میں یزید کو صحابی رسول کہا ہے اوران کے خوب فضائل بیان کئے،تقریر کے بعد خیال آیا کہ معلوم تو کروں کہ یزید پیدا کب ہوا ہے؟ میں نے عرض کیا واہ مولانا! صحابیت پہلے ثابت کردی،فضائل کے

ڈونگرے برسادیئے اوراب پوچھ رہے ہیں کہ سن پیدائش کیا ہے؟

ایسا ہی ایک واقعہ اور پیش آیا کہ پشاور کی ضلعی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی کہ مختلف چوکوں کے نام حضرات عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی سے معنون کیے جائیں، مجھے ایک جماعت کے ذمہ دار ساتھی نے فون کر کے بتایا کہ ہم نے قرارداد تو منظور کروالی ہے، عشرہ مبشرہ کے نام معلوم نہیں، آپ مہربانی فرما کر کے جلدی جلدی بتلادیں کہ ابھی ضلعی ناظم اعلیٰ صاحب کو پیش کرتے ہیں۔

راولپنڈی کے ہمارے ایک عالم دین دوست جو کہ ایک تعلیمی ادارہ کے پرنسپل بھی ہیں انہوں نے بتایا کہ میرے ایک دوست جو مفتی ہیں انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ ''صحاح ستہ'' میں کون کون سی کتابیں شامل ہیں اور کیا ''مشکوٰۃ شریف'' بھی ''صحاح ستہ'' ہی میں شمار ہوگی۔؟

ایسے معاملات میں ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے۔ منصب افتاء کی حساسیت اور نزاکت کو مدنظر رکھ کر فتویٰ لینا بھی چاہیے اور دینا بھی چاہیے۔

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی (دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ تعالیٰ نے باضابطہ افتاء کا کوئی کورس تو نہیں کیا تھا، اپنے اکابر اور اساتذہ کرام ہی کے زیر تربیت رہے، ان ہی سے اصلاح لیتے رہے، اخذ فیض کرتے رہے اور پھر اس درجہ کے محتاط فتاویٰ تحریر فرمائے کہ آج بھی ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔ ایسے ہی ہمارے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ نے باضابطہ افتاء کا کورس تو نہیں کیا تھا مگر ان کی تحریروں میں جو فقاہت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اسی احتیاط اور فقاہت ہی کی بنیاد پر اللہ رب العزت نے ان کو وہ علمی مقام عطا فرمایا جس سے ہر خاص و عام مطلع ہے۔

اس لیے نئے مفتیان کرام سے ہماری التماس ہے کہ اپنی علمی استعداد کو مزید پختہ کریں اور اہل علم اکابر کے کام سے برابر استفادہ کرتے رہیں تو ان شاء اللہ ان کے فتوؤں میں مزید نکھار اور افادیت پیدا

ہو جائے گی۔

ہمارے لیے ایک اور المیہ بنات کے مدارس کے ''شیوخ حدیث'' بھی ہیں۔ دورہ حدیث کی تکمیل کے اگلے ہی سال منصب ''شیخ الحدیث'' کو زینت بخشی جاتی ہے۔ کہاں وہ دور کہ اس منصب جلیلہ پہ وہ علماء کرام متمکن ہوتے تھے جن کی نظر تمام کتب حدیث اور کتب فقہ پر ہوتی تھی۔

زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، پاکستان ہی میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، حضرت مولانا خیر محمد جالندھری، حضرت مولانا محمد عبداللہ (جامعہ رشیدیہ ساہیوال)، حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا مفتی محمود، حضرت مولانا عبدالحق، حضرت علامہ محمد شریف کشمیری، حضرت مولانا قاضی محمد اسلم، حضرت مولانا خلیل الرحمٰن، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر، حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا محمد صدیق جالندھری، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ، مولانا نذیر احمد جیسے جبال امت نے اس مسند کو زینت بخشی ہے۔ ان میں سے جو اللہ رب العزت کے ہاں جا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں، درجات بلند فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائیں۔ جو حیات ہیں اللہ تعالیٰ ان کی زندگیوں میں برکت نصیب فرمائیں، تادیر ان کا سایہ شفقت ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ ان سے استفادہ کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔

ان اسمائے گرامی سے مقصود ''شیوخ حدیث'' کی فہرست مرتب کرنا نہیں، بلکہ اس مسند کے مقام ومرتبہ اور شان کو بتلانا ہے اور کہاں اب وہ جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ مشکوٰۃ، صحاح ستہ میں شامل ہے یا نہیں؟

اس لیے ہماری التماس ہے کہ ان تمام گذارشات کو ''تنقید'' سے تعبیر نہ کیا جائے، اصلاح احوال کے لیے ان تمام معاملات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور جن چیزوں کے تدارک کی ضرورت ہے ان کا تدارک کر کے اصلاح احوال کیا جائے۔ ہماری ان مخلصانہ ودردمندانہ گذارشات پر ہمیں قابل گردن

زدنی قرار نہ دیا جائے اور بڑے ہی ٹھنڈے دل ودماغ سے ملکی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے حالات وواقعات کی سنجیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان مسائل اور اُلجھنوں کا حل تلاش کیا جائے گا۔

ہمیں ایک دینی رہنما کے درج ذیل مؤقف کو ضرور اپنانا چاہیے!

''جو حضرات میرے اور............ کے خلاف دل کا بغض نکالتے ہیں، ان کے معاملہ کو میں نے اللہ کے حوالہ کر دیا ہے، اس کے لیے ان کی ساری تحریریں پڑھتا ہوں اور اللہ کی عدالت کے سپرد کر کے اپنے کام میں لگ جاتا ہوں۔ میری عاقبت درست کرنے کے لیے جو کام ضروری ہیں وہی اتنے زیادہ ہیں کہ دوسرے کسی کام میں ایک لمحہ بھی صرف کرنا مجھے تضیع وقت نظر آتا ہے۔

یہ حضرات اپنی عاقبت سے غافل ہیں تو ہوں، اور اپنی عاقبت ہی کے لیے میرے خلاف بولتے ہیں اور لکھنے کو مفید سمجھتے ہیں تو دونوں صورتوں میں اپنے وقت اور محنت کا مَصرَف تجویز کرنے کی انہیں پوری آزادی ہے۔ میں انشآء اللہ ان کی کبھی مزاحمت نہیں کروں گا۔ اور کم از کم میری تو یہ خواہش بھی نہیں ہے کہ میرے رفقاء اور دوستوں میں سے کوئی ان کی مزاحمت کرے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ جو حیثیت فی الواقع مجھے اللہ نے دی ہے اسے کوئی چھین نہیں سکتا اور جو حیثیت اللہ ہی نے مجھے دی وہ کوئی بھی مجھے دلوا نہیں سکتا۔

بہر حال اگر ان لوگوں کی زیادتیوں کو دیکھ کر کسی کو غضب اور غصہ لاحق ہو ہی جائے تو میں اسے اللہ ہی کی خاطر نصرت حق سے باز رہنے کے لیے بھی نہیں کہتا، خصوصاً جب کہ وہ اللہ ہی سے اَجر کی اُمید پر یہ کام کر رہا ہو۔''

مندرجہ بالا مؤقف کو اگر ہمارے اکابر واصاغر دونوں اپنا لیں اور اسے مشعل راہ بنا لیں تو امید ہے کہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔

زندگی کا مقصد کیا؟

مفتی محمد سعید خان

آپ اپنے گرد و پیش کی اشیاء پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بامقصد پیدا کیا ہے۔ اس کی ذات مقدسہ اس عیب سے پاک اور بلند و بالا ہے کہ کوئی فضول کام کرے۔ آسمان، زمین، سورج، چاند اور ستارے ہر ہر جسم سے اس کائنات کے منافع وابستہ ہیں۔ ہوا اور پانی پر زندگی کا دارومدار ہے۔ مٹی میں نمو ہے، کیسے کیسے گل وگلزار پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں فنا کی صلاحیت بھی پوشیدہ ہے کہ بڑی بڑی عظیم الشان عمارات اور تہذیب وتمدن کی علامات مل کر خاک ہو جاتی ہیں۔ لوہے میں بقا کا سامان ہے، قومیں اس کے ذریعے اپنا دفاع کرتی ہیں، عالم اسباب میں جہاد آج تک اس کے بغیر برپا نہیں ہوا، نباتات انسانوں اور جانوروں کی بھوک مٹاتی ہیں جانوروں سے کام و دہن کی لذت اٹھائی جاتی ہے۔

الغرض آپ کسی بھی چیز کو اٹھا کر دیکھ لیجئے قدرت نے اس میں منافع رکھے ہیں، اس کی تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے اور وہ بے کار پیدا نہیں کی گئی، یہاں تک کہ بچھو کے ڈنک اور سانپ کے زہر میں بھی ایک مقصدیت ضرور کارفرما ہے۔ اشیا کے بامقصد و نافع ہونے کی حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد اس بات پر غور کیا جانا بھی ضروری ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ ہمیں اور آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور اس عالمِ رنگ و بو میں بھیجا تو اس کی غرض و غایت کیا تھی؟ جس کائنات کے ذرے سے لے کر آفتاب تک ہر ہر چیز میں کوئی نہ کوئی حکمت و مصلحت کارفرما ہو کیا اس میں انسان جیسی عظیم مخلوق بے کار پیدا کی گئی؟ جس انسان کو خلافت سے سرفراز فرمایا گیا اور ایسی امانت اس کے سپرد کی گئی

جسے زمین و آسمان اور پہاڑوں نے اٹھانے سے بے بسی کا اظہار کر دیا تھا۔[1] کیا اس وجود کی تخلیق میں کوئی مقصدیت کارفرما نہ تھی؟ بس اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ ہمارا مقصد تخلیق کیا تھا؟

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے:

افحسبتم انما خلقنكم عبثا وانكم الينا لا ترجعون

ترجمہ: ہاں تو تمہارا خیال (یہ) تھا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بغیر مقصد کے پیدا کر دیا ہے اور تم ہمارے پاس لوٹ کر نہ آؤ گے۔[2]

ایک دوسرے مقام پر اس حقیقت کی طرف یوں متوجہ کیا گیا ہے:

ايحسب الانسان ان يترك سدى

کیا انسان اس خیال میں ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟[3]

ان آیات میں اس بات کی شدت سے نفی کی گئی ہے کہ انسان بے کار پیدا کیا گیا ہے اور اس کی پیدائش کا کوئی مقصد نہ تھا اور اسے اپنے اعمال و کردار کا کوئی حساب و کتاب کسی کو نہیں دینا۔ یقیناً اس کی تخلیق میں مقاصد و منافع کارفرما ہیں اور جب تک انسان اپنی تخلیق کے اس مقصد کو نہیں پالیتا تب تک وہ خود اپنی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہ اصول ہے کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اس مقصد کے

---

[1] یہ اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف ہے جو پارہ:۲۲، سورہ احزاب، آیت:۷۲ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ ہم نے امانت آسمانوں اور زمین میں پیش کی سو سب نے اس (کے اُٹھانے) سے انکار کیا کہ اسے اٹھائیں اور اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یہاں امانت سے مراد خلافت دنیوی و تجلی ذاتی کی استعداد و قابلیت ہے۔

[2] پارہ:۱۸، سورہ مومن، آیت:۱۱۵

[3] پارہ:۲۹، سورہ القیامۃ، آیت:۳۶

اعتبار سے متعین ہوتی ہے جس مقصد کے لیے اس چیز کو بنایا گیا ہے۔ اگر وہ چیز اس مقصد کو پورا کرے تو یہ تکمیل کار اس کے مقام اور قیمت کا تعین کرتی ہے۔ مثلاً یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص بھینس کو اس لئے خریدتا اور خدمت کرتا ہے کہ دودھ حاصل کرے، جب تک یہ بھینس دودھ دیتی رہے گی اپنی بقا کا جواز بھی فراہم کرے گی اور اپنی قیمت کا تعین نفع کی نسبت سے کروائے گی اور جب یہ دودھ دینا چھوڑ دے گی تو وہ مقصد جس کے لئے اس کی خدمت اور بقا ضروری تھی، ختم ہو جانے پر قصاب کے حوالے کر دی جائے گی۔ اشیاء کا اعتبار ہمیشہ مقصد کے تحت ہوا کرتا ہے۔ ایک شخص یہ چاہے کہ پانی گرم کرے اور آگ کے حصول کے لئے کسی بھی علم و فن کی ایک کتاب کا ایک ایک صفحہ اس برتن کے نیچے جلاتا رہے تو پانی تو یقیناً اس طرح بھی گرم ہو جائے گا مگر کتاب جس مقصد کے لئے لکھی گئی تھی وہ مقصد ضرور فوت ہو جائے گا۔

بقائے اصلح: یہی حال انسان کا بھی ہے کہ اگر وہ اپنے مقصد کے مطابق کام کرے گا تو وہ باقی رہے گا اور اگر اس سے ہٹ جائے گا تو پھر اس کی زندگی بے کار اور اعمال بے وزن ہو جائیں گے۔ قدرت کا قانون ہے کہ جو فرد یا قوم صحیح مقصد کے مطابق چلتی ہے اسے بقا کی ضمانت دی جاتی ہے اور جو اپنے مقصد کو فراموش کر دے یا اس ڈگر کو تبدیل کرے جو مقصد تک پہنچاتی ہے تو پھر اس کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔ بقائے اصلح (SURIVAL OF THE FITTEST) کا قانون شریعت اور عقل، ہر ایک کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔

اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

فاما الزبد فیذھب جفآء واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض کذلك یضرب اللہ الامثال .

جو جھاگ (پانی پر اور مختلف دھاتوں کو پگھلاتے وقت اوپر کی سطح پر آتا ہے) وہ نکما ہو کر اتر جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع دیتی ہے وہ دنیا میں رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ مثالیں دے کر اپنی بات سمجھایا کرتا ہے۔

ہماری زندگی کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ بات ہمیں معلوم ہے؟ اگر معلوم ہے اور ہم اس کے مطابق زندگی بسر کررہے ہیں، شب و روز اس مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہیں تو ہمیں یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ ہم سے زیادہ خوش قسمت فرد یا قوم دنیا و آخرت میں کوئی نہیں، لیکن اگر ہم اپنے مقصد کے مطابق کام نہیں کررہے تو پھر اس زمین کا بوجھ ہیں جسے بہت جلد دور ہو جانا چاہیے۔ ہمیں اس کائنات کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں اور ہمیں جلد یا بدیر مٹنا پڑے گا اور وہ افراد اور اقوام آگے بڑھ کر کام کریں گے جو اپنے مقصد حیات کو پہچانتے ہوں اور اپنی قدر و قیمت کو خود منوا سکیں۔ جن افراد و اقوام میں اپنے وجود کو خود منوانے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ محض اپنے ماضی کے قصے سنا سنا کر باقی رہنے کا حق حاصل کرنا چاہتی ہیں زمانہ ان کا ساتھ نہیں دیا کرتا۔ یہاں تو مقصد کے مطابق کام کرکے اپنا وجود تسلیم کرانا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا ضروری ہے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ہمیں کیوں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے؟ وگرنہ وقت کی کی دوڑ اتنی تیز ہے کہ جو اپنے مقصد کے خلاف کام کرے گا یہ چکی اسے ردی اور بے کار ثابت کرکے باہر اٹھا پھینکے گی۔

جواز بقا: اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہم مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق ''مثنوی'' سے ایک قصہ باختصار نقل کرتے ہیں۔

قصہ یوں ہے کہ ایک اونٹ، بیل اور دنبہ کہیں جارہے تھے اور تینوں کو بھوک تنگ کررہی تھی۔ ایک مقام پر اچانک انہیں گھاس کا ایک پولہ نظر آیا اور وہ تینوں للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے مگر اس مشکل میں پڑ گئے کہ گھاس تھوڑی ہے اور کھانے والے تین ہیں اگر تقسیم کریں تو سب بھوکے رہ جائیں گے اور اگر کھانے کو ملے تو کس کا حق بنتا ہے؟ دنبے نے اس معمے کے حل کے لئے بات شروع کی اور جناب رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا تذکرہ کیا جس میں بڑی عمر والوں کا زیادہ حق ماننے کی تعلیم دی گئی ہے

اور یہ ثابت کیا کہ ہم تینوں میں سے جس کی عمر زیادہ ہو اسے یہ گھاس کھانے کا حق حاصل ہے۔ اونٹ اور بیل نے دنبے سے پوچھا کہ تیری عمر کیا ہے؟ تو اس نے شیخی بھگاری کہ میری عمر کا دوستو کیا پوچھتے ہو تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے فدیے میں ایک دنبہ ذبح کیا گیا تھا تو میں اور وہ دونوں ایک ہی چراگاہ میں چَرا کرتے تھے۔ یہ بات سن کر بیل بہت پریشان ہوا کہ یہ تو بہت دور کی کوڑی لایا ہے اب میں اپنی عمر اس سے زیادہ کیسے ثابت کروں؟ پھر اس کو جو سوجھی تو کہنے لگا یارو تم جانتے ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اتارے گئے تو یہاں آ کر انہوں نے کاشت کاری شروع کی تھی۔ ان کے ہل میں دو بیل جتے تھے جن میں سے ایک تو مر گیا اور دوسرا میں ٹھوکریں کھانے کو ابھی تک زندہ ہوں۔ یہ کہہ کر دل میں بہت خوش ہوا کہ دنبے سے تو زیادہ عمر بتلائی ہی ہے، اونٹ بھی کیا یاد کرے گا اور اب اپنے آپ کو کتنی زیادہ عمر کا ثابت کرے گا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اونٹ نے دونوں کی بَڑ سن کر کچھ کہے بغیر گھاس کا وہ پولہ اٹھا لیا اور اسے بلند گردن سے اتنا اونچا لے گیا کہ دنبہ اور بیل منہ دیکھتے رہ گئے، پھر کہنے لگا میرے دوستو مجھے نہ تو بحث کی ضرورت ہے اور نہ تاریخ دھرانی ہے۔ نہ اپنی سوانح عمری بتانے قائل ہوں اور نہ عمر ہی کے کم یا زیادہ ہونے کے چکر میں پڑتا ہوں۔ اگر یہ اصول درست ہے کہ کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے اپنی قوت اور طاقت منوانا پڑتی ہے اور اپنا حق ثابت کرنا پڑتا ہے اور عقل کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ یہ اصول درست ہے تو پھر تم میرے جسم اور عالی شان گردن کو دیکھو تم جس بَل بوتے پر اپنا حق گھاس کے اس پولے پر ثابت کر رہے ہو اس کی بنیاد تو تاریخ ہے اور جس وجہ سے میں ثابت کر رہا ہوں اس کی بنیاد موجودہ حالت ہے تو تاریخ کو موجودہ حالت کے مقابلے میں کون قابل اعتنا سمجھتا ہے؟ تم اگر موجودہ حالات میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تو تمہارا شاندار ماضی تمہیں اب کوئی نفع نہیں دے سکتا اور یہ کہہ کر وہ گھاس ہڑپ کر گیا۔[1]

---

(۱) حصہ ششم، ص: ۲۴۱

اسی بات کو علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

سو جو فرد، قوم اور معاشرہ اپنے مقصد سے ہٹ جائے اور اپنی بقا کا استحقاق ثابت نہ کر سکے زمانہ خود اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

وسائل اور مقاصد: یہ تو بات اس فرد اور معاشرے کی ہے جنہیں اپنے مقصد حیات کا علم ہو اور وہ پھر اس کے خلاف کام کر رہے ہوں۔ لیکن جس قوم کو یہی خبر نہ ہو کہ وہ کیوں جی رہی ہے؟ وہ اپنے مقاصد کو ہی نہ جانتے ہوں، ان کی تباہی اور ان کی پستی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ کیا ہمیں معلوم ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال تو بہت بعد کا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں؟ یہاں تو سرے سے مقصد ہی سے بے خبری ہے۔ اگر آپ کو اس بات کے ماننے میں تردد ہو تو آپ کچھ وقت نکال کر کسی کالج، یونیورسٹی دفتر یا شاپنگ پلازہ کے صدر دروازے (Main Gate) پر کھڑے ہو جایئے اور پوچھنا شروع کیجئے کہ آپ کیوں جی رہے ہیں؟ آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ تو اوّل تو اکثریت ان سوالات ہی کو سمجھ نہیں پائے گی۔ کیونکہ انہوں نے اس بات کو سوچنے کی زحمت ہی کبھی گوارا نہیں کی اور اگر کوئی اس میدان میں جواب دے بھی پائے گا تو اس کی پرواز (۱) مال و دولت (۲) عزت و اقتدار اور (۳) عورت و نفس پرستی سے زیادہ بلند نہ ہو گی۔ شاید ہزار میں کوئی ایک فرد ایسا ملے جو جانتا ہو کہ وہ کیوں جی رہا ہے، اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا محنت کر رہا ہے؟ زندگی جیسی عظیم چیز کو مندرجہ بالا تین باتوں کو ہدف و منزل بنا کر گزار دینا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں ان کاموں میں صرف کر دینا ایسا ظلم ہے جس کی جواب دہی آخرت میں تو ہو گی سو ہو گی۔ (باقی آئندہ)

امام اہلِ سُنّت

حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی مجدّدی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

اپنے وقت کے ایک مشہور صاحب لسان اور صاحب قلم عالم اور ہفتہ وار ''النجم'' لکھنؤ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حضرت مولانا کا تذکرہ تو میں اپنے بچپن سے سنتا تھا، لیکن زیارت کا اتفاق سب سے پہلے اب سے تقریباً ۳۸۔۳۹ سال قبل (غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء) جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مراد آباد میں ہوا تھا، چونکہ مولانا کی شہرت ایک مقرر ومناظر اور ایک ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی، اس لیے دیکھنے سے پہلے ان کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے وہ روشن خیال اور فیشن ایبل قسم کے مولانا ہوں گے۔ مثلاً شیروانی وغیرہ پہنتے ہوں گے، شوقیہ چشمہ لگاتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ، لیکن مراد آباد کی ایک سڑک پر راستہ چلتے ہوئے کسی واقف نے جب مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب جو پیدل چلے جا رہے ہیں یہی ''النجم'' کے ایڈیٹر مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی ہیں، تو اپنے تصور کے بالکل خلاف مولانا کی ہیئت اور وضع قطع دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، بالکل پرانے قسم کے سیدھے سادے علماء کی وضع تھی، سر پر وہی پرانے علماء کا سا عمامہ، جسم پر عبا، ہاتھ میں لاٹھی نما عصا— جمعیۃ کے اجلاس عام میں مولانا کی بھی تقریر کا وقت رکھا گیا تھا، آپ نے بجائے اس کے کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم کا لحاظ فرماتے ہوئے اس کے مناسب کوئی سیاسی یا نیم سیاسی یا کم ازکم متکلمانہ وفلسفیانہ قسم کی کوئی علمی تقریر فرماتے، بس وعظ فرمایا جس کا بڑا حصہ نماز سے متعلق تھا، قدرتی طور پر بہت سوں کو تعجب ہوا کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر اس وعظ کا کیا موقع تھا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عرصہ سے مولانا کا یہ التزام ہے کہ وہ ہر تقریر میں نماز کی خاص طور سے تلقین وتاکید فرماتے ہیں اور گویا یہ اُن پر طاری ہے ـــــ

پھر اسی سال کچھ عرصہ کے بعد ایک ضرورت سے امروہہ میرا جانا ہوا، میں ان دنوں منطق وفلسفہ اور اصول فقہ وعلم کلام کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مولانا آج کل مدرسہ اسلامیہ چلّہ (امروہہ) میں صدر مدرس ہیں، میں مولانا کی زیارت کے ارادے سے، نیز اس نیت سے کے موقع ملے گا تو کسی سبق میں بھی شریک ہوکر استفادہ کروں گا۔ مدرسہ گیا لیکن اس وقت اتفاق سے طب کی مشہور کتاب نفیسی کا آپ کے یہاں درس ہورہا تھا، میں بیٹھا تو پورے سبق میں رہا، لیکن وہ میری دلچسپی کی چیز نہیں تھی، البتہ یہ بات اسی دن معلوم ہوئی کہ مولانا فن طب کے بھی فاضل ہیں۔ بعد میں جب حالات سے زیادہ واقف ہونے کا موقعہ ملا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شروع میں کچھ عرصہ مطب بھی کیا تھا لیکن بعد میں اس سے بالکل ہی کنارہ کش ہوکر اُن خالص علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے جو اللہ کو آپ سے لینے تھے۔

رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اتفاق سے تین سال میں اسی مدرسہ اسلامیہ میں مدرس رہا جس سے مولانا کا تعلق رہا تھا، اس مدرسہ کے اکثر کارپرداز اور ارباب انتظام چونکہ حضرت مولانا سے عقیدت وارادت کا خاص تعلق رکھتے تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے مولانا نے اپنے سنجلے صاحبزادے مولوی عبدالمومن صاحب فاروقی کو تعلیم کے لیے وہاں بھیج دیا تھا، اس لیے سال میں دوچار مرتبہ ضرور مولانا کی تشریف آوری امروہہ میں ہوتی تھی، اور میری طبیعت کو چونکہ مولانا سے خاص مناسبت تھی اور مذاہب باطلہ اور فرقہ ہائے ضالہ کی تردید سے اس زمانہ میں راقم سطور کو بھی گہری دلچسپی تھی اور مولانا بھی انہیں وجوہ سے ناچیز پر خاص الخاص عنایت وشفقت فرماتے تھے، اس لیے ہر ملاقات میں ربط وتعلق بڑھتا اور گہرا ہوتا رہا ـــــ کچھ عرصہ کے بعد (غالباً ۱۳۵۰ھ میں) حضرت مولانا کے ساتھ رنگون اور برما کے بعض دوسرے مقامات کا ایک طویل سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ سفر اہل رنگون کی دعوت پر وہاں ایک مذہبی فتنہ کے سر اٹھانے کی وجہ سے کرنا پڑا تھا، اس سفر میں قریباً ایک مہینہ شب وروز مولانا کے ساتھ رہنے کا

اتفاق ہوا، اور ممدوح کو اب تک جو کچھ جانا اور سمجھا تھا، اس سفر میں اس سے بہت زیادہ جانا اور سمجھا تھا، اس سفر کے غالبًا ایک ہی سال بعد مولانا نے دارالمبلغین قائم فرمایا اور اس میں کام کرنے کے لیے اس عاجز کو بھی بلایا، اس موقع پر بھی چند مہینے ایک نیاز مند رفیق کی حیثیت سے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق ہوا — اس کے بعد بھی بار بار سفر و حضر میں مولانا کے قریب بلکہ ساتھ رہنے کا اس قدر اتفاق ہوا کہ دورِ طالب علمی کے بعد اپنے مخصوص اساتذہ کے ساتھ رہنے کا اتفاق غالبًا نہ ہوا ہوگا۔

قریباً ۳۵ سال کے اس تعلق میں مولانا کی زندگی کے جن علمی عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے میں واقف اور متاثر ہوا، کسی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر میں ان میں سے چند حوالہ قلم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کے بارے میں اپنی معلومات اور تاثرات کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہوں۔ ایک وہ جن کا تعلق علم و تحقیق، اور تصنیف و مناظرہ کی لائن کے امتیازات سے ہے، اور دوسرے وہ جن کا تعلق عبادت گذاری اور پرہیز گاری جیسی درویشانہ صفات سے ہے۔

علمی رسوخ: ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی حضرت مولانا کی شہرت مسلک اہل سنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر متکلم کی حیثیت سے رہی ہے اور اس کام کے لیے یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اس زمانے میں کسی خاص درجہ کے رسوخ علمی کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے جن لوگوں کو مولانا کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا ان کو غالبًا بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ ممدوح صرف مناظر و مصنف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے، نامور اصحاب درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور اپنے دائرہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا، اسی کے ساتھ قدرت نے حافظہ بے نظیر دیا تھا۔ راقم سطور نے اپنی عمر میں بہت کم حضرات ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں [1]

---

[1] جن لوگوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں انہیں یاد ہوگا کہ صرف قرآنی آیات واحادیث ہی نہیں بلکہ شیعوں

سلامتی فہم کے ساتھ ذہانت وذکاوت سے بھی اللہ تعالیٰ نے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، ان سب چیزوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا — علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے علم قرآن سے خاص شغف تھا، آپ کا سلسلہ تفسیر آیات آپ کے تدبُّر فی القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے۔

کی کتب حدیث و اسماء الرجال اور بعد کے ان کے مصنفین کی کتابوں کی بھی لمبی لمبی عبارتیں حتیٰ کہ شاہ نامہ اور حملہ حیدری کے صفحے کے صفحے مولانا بالکل حافظوں کی طرح پڑھتے تھے۔ مولانا کی اس آخری بیماری ہی کا واقعہ ہے مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ فردوسی نے شاہ نامہ میں اپنے آتش پرست نسلی اکابر کا تذکرہ جس فخریہ انداز میں کیا ہے اور ان کے مقابلے میں صحابہ کرامؓ کو جس طرح اس نے حقیر و بے حیثیت دکھانے کی کوشش کی ہے اس کے خلاف ایرانی مسلمانوں کی طرف سے کوئی آواز اس وقت اٹھی تھی یا نہیں؟ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی آواز اٹھی ہوگی تو مولانا کو اس کا ضرور علم ہوگا میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیماری اور اس کے پیدا کردہ ضعف و نقاہت کے علاوہ برسوں پہلے سے مولانا کے لیے بڑھاپے کا وقت آچکا تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے ”لکیلا یعلم بعد علم شیئا“ مطلب یہ ہے کہ انسان جب زیادہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو حاضر علم بھی غائب ہو جاتا ہے۔ ضعف کی وجہ سے مولانا کے لیے اس وقت بات کرنا بھی مشکل تھا، اس کے باوجود میں نے یہ بات دریافت کی تو فرمایا کہ ”صحیح العقیدہ ایرانی مسلمانوں کی طرف سے شاہ نامہ کے خلاف بڑے زور کے ساتھ آواز اٹھی تھی“ ”صولت فاروقی“ ایک مستقبل کتاب لکھی گئی، یہ منظوم ہے اور گویا شاہ نامہ کا جواب ہے، چھپ بھی چکی ہے میں نے اس کا مطبوعہ نسخہ ہی کبھی دیکھا تھا، پہلے تو اس کا خاصا حصہ یاد تھا، اب کچھ یاد نہیں رہا، پھر فرمایا ہاں ایک شعر یاد آ گیا اور شاید وہی آپ کے مقصد کے لیے کافی ہوگا۔ وہ شعر یہ ہے فردوسی کے بارے میں مصنف لکھتا ہے۔

؎ دلش گبر و جاں گبر و گیری زباں زگیراں بگیروی زباں قصہ خواں

بہرحال مولانا اپنے غیر معمولی حافظہ کے لحاظ سے اللہ کی قدرت کی ایک نشانی تھے۔

تحریر وتقریر کا امتیاز: تحریر وتقریر بہت سادہ، ہر قسم کے تکلف وتصنع سے بری، حشو وزوائد سے پاک اور عبارت آرائی سے خالی مگر نہایت دلنشین ہوتی تھی، میں نے کسی صاحب قلم عالم کو نہیں دیکھا جس کی تحریر وتقریر میں اتنی یکسانی اور مطابقت ہو، اگر کوئی شخص مولانا کی تقریر لفظ بلفظ لکھتا تو اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کے لیے کسی لفظی ترمیم کی بھی غالباً ضرورت نہ ہوتی، تقریر میں اثر وزور پیدا کرنے کے لیے مولانا اُس مبالغہ کے بھی روادار اور عادی نہیں تھے، جس کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح کمزور روایتیں (اگرچہ وہ علمی حلقوں میں بھی کتنی ہی مشہور ہوگئی ہوں) مولانا ان کے ذکر سے احتیاط فرماتے تھے۔ ہماری اس صدی کے بہت بڑے حقانی عالم حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب محدث امروہوی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا) میں نے ایک مجلس میں اُن سے خود سنا حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں اُن کی اس بات کا بہت ہی معتقد ہوں اور اس کو ان کی کرامت سمجھتا ہوں کہ وعظ میں بھی کوئی بات غیر تحقیقی بیان نہیں فرماتے۔

مناظرہ کا امتیاز: قوت استدلال اور متانت وسنجیدگی آپ کے مناظرہ کا خاص امتیاز تھا، آپ کے متعدد مناظرے چھپے ہوئے ہیں، جن لوگوں نے کبھی آپ کا مناظرہ سنا ہے، وہ ان کتابی مناظروں کے مطالعہ کے وقت بالکل ایسا ہی محسوس کریں گے کہ حضرت مولانا بول رہے ہیں۔ محقق مناظر کبھی خلط مبحث نہیں کرتا بلکہ اپنی قوت اس پر صرف کرتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ روشنی میں آجائے، مولانا کا بالکل یہی طرز تھا، اسی لیے وہ فریق مخالف کی خلط مبحث کی کوششوں کو چلنے بھی نہیں دیتے تھے، اور وہ ہزار کوششوں کے باوجود خلط مبحث میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا، بحث کے مرکزی نقطہ کو مولانا ہر تقریر میں ضرور دہرا دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عام سامعین کو بھی وہ خاص بات حفظ ہوجاتی تھی، فن

کے لحاظ سے یہ مناظر کا کمال ہے اور احقاقِ حق کے مقصد کے لیے بھی یہ ضروری اور ناگزیر ہے۔

خاص موضوع: اگرچہ حسب ضرورت مولانا نے مناظرے عیسائیوں سے بھی کیے، آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے بھی، اور ان کے علاوہ دوسرے فرقہ ہائے ضالّہ سے بھی، لیکن مولانا کا خاص موضوع شیعی حملوں سے صحابۂ کرام اور مسلک اہل سنت کی حفاظت اور ان کا دفاع اور مذہب تشیع کی ضلالتوں کو واضح کر کے حجت قائم کرنا تھا، اور یہ وہ موضوع تھا جو ہندوستان کے خاص تاریخی حالات کی وجہ سے اس ملک کے اکابر علماء و مصلحین کی علمی اور دینی کوششوں کا صدیوں سے خاص موضوع رہا ہے ــــ اب سے قریباً ساڑھے تین سو سال پہلے گیارہویں صدی ہجری میں تاریخ اسلام کے عظیم ترین مجدد امام ربانی شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے معاصر بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد استاذ الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ، اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، الغرض اپنے اپنے زمانہ میں اُن سب ہی حضرات کی دینی اور اصلاحی کوششوں کا خاص موضوع اور ہدف (اُن خاص تاریخی اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) یہی مسئلہ رہا ہے ــــ جس شخص نے اس موضوع سے متعلق ان اکابر کی کتابیں دیکھی ہیں اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے، اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا نے اس موضوع کو اپنے ان پیش رو اکابر سے کئی گنا زیادہ نکھارا، اور ایک سعادتمند پیروکار کی طرح ان کے کام کی تکمیل کر کے ان کی روحوں کو شاد اور مطمئن کیا ــــ اس ناچیز کا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا کی تحقیق و تنقیح نے اس دائرے کے کئی بنیادی مسئلوں کو جو علمی اور نظری تھے اور ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے ایسا ہی بدیہی بنا دیا کہ عامیوں کے لیے بھی ان کا سمجھنا آسان ہو گیا۔

ردّ شیعہ کے مشغلہ میں مولانا کی نیت اوراس موضوع سے ان کے غیر معمولی شغف کا اصل باعث: مولانا نے ایک صحبت میں مجھ سے خود فرمایا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموس کی حفاظت اوران کے خلاف کیئے جانے والے پروپیگنڈے کی تردید بجائے خود بھی عبادت بلکہ فریضہ ہے لیکن میں جواس کام کو درجۂ اول کی اہمیت دیتا ہوں اوراس میں اس طرح مشغول ہوں، خدا گواہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجروح ہو جانے کے بعد قرآن مجید اور نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سب مشکوک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے واسطے سے جانتے ہیں، اگراس سلسلے کی پہلی کڑی اور دین کے ناقلوں کی پہلی صف ہی نا قابل اعتبار ہوگئ تو قرآن اور سارا دین مشکوک ہو جائے گا اور ہمارے پاس اُن کے بارے میں یقین کی کوئی علمی بنیاد نہیں رہے گی۔ بہرحال میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حمایت اور مدافعت اور اُن کے دشمنوں کا یہ مقابلہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی نیت ہی سے کرتا ہوں اور مجھے اپنی مغفرت کی سب سے زیادہ امید اپنے اسی عمل سے ہے۔

غیر معمولی اعتدال: مناظرہ کے میدان میں رہنے کے بعد راہ اعتدال پر قائم رہنا بڑی مشکل بات ہے، اللہ ہی اگر توفیق دے اور دستگیری فرمائے تو آدمی اعتدال پر قائم رہ سکتا ہے ورنہ اس میدان میں قدم رکھنے والے کا افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جانا ایک عام بات اور اکثری تجربہ ہے، ناچیز نے اس پہلو سے حضرت مولانا کو بہت ہی ممتاز اور باتوفیق پایا۔صرف ایک مقولہ نقل کرتا ہوں جو مولانا سے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، سابقین اوّلین کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں اور

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں لیکن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ان کو کیا نسبت؟ ان کی مجلس میں اگر صفِ نعال میں بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جگہ مل جائے تو ان کے لیے سعادت اور باعث فخر ہے۔‘‘

یہاں تک کہ جن خصوصیات کا میں نے ذکر کیا ان کا براہ راست تعلق مولانا کی عالمانہ یا مناظرانہ حیثیت سے ہے، اگرچہ ان کی عارفانہ اور درویشانہ حیثیت کا بھی اُن میں خاصا حصہ ہے، اب دو چار باتیں میں وہ عرض کرتا ہوں جن کا تعلق خاص طور سے اس دوسری حیثیت سے ہے۔

نماز کے ساتھ قلبی اور نسبت نبوی ﷺ: نماز اس حیثیت سے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس گئی گذری حالت میں بھی ہر وہ مسلمان اس کا پابند ہے جس کو خوف خدا اور فکر آخرت کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہے۔ بہرحال اس حیثیت سے نماز ایک عوامی چیز ہے لیکن نماز کے ساتھ دل کا لگاؤ، اس کا کماحقہٗ اہتمام اور فکرمندی اور لوگوں میں نماز کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پروائی دیکھ کر دل کڑھنا اور بے چین ہونا بلاشبہ یہ کیفیات رسول اللہ ﷺ اور آپ سے بھی پہلے کے جدامجد سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام کی خاص نسبت اور وراثت ہے انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بسا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔

رَبَّنَا اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُو الصَّلٰوۃَ .

اے میرے پروردگار میں نے اپنی نسل کو تیرے مقدس ومحترم گھر کے پاس بن کھیتی والی وادی میں بسا دیا ہے اے میرے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

اور عرض ومعروض اور مناجات کے اسی سلسلے کے آخر میں دعا کی تھی۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ . میرے رب مجھے بنادے نماز کا قائم کرنے والا اور میری نسل کو بھی یہ چیز نصیب فرما، پروردگار میری دعا قبول فرما۔

اور خاتم النبیین ﷺ نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو آخری وصیت اُمت کو فرمائی تھی اس میں سب سے پہلے نماز ہی کی تاکید تھی ۔ بہرحال نماز کے ساتھ فکرمندی کا یہ تعلق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس کے حبیب پاک حضرت محمد ﷺ کی خاص وراثت ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو اس سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک مدت تک مولانا کا یہ التزام رہا کہ ہر وعظ میں نماز کی تلقین وتاکید ضرور فرماتے تھے، بلکہ اس دور میں نماز ہی ان کے مواعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا۔ اس عاجز نے خود بھی نماز کے بارے میں مولانا کا وعظ سنا ہے، صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ فرمارہے ہیں بے چین دل کی گہرائی سے فرمارہے ہیں ۔حضرت مولانا نے غالبًا اسی زمانہ میں نماز کے موضوع پر ایک بڑی مؤثر مستقل کتاب بھی ''کتاب الصلوٰۃ'' کے نام سے لکھی تھی، اس میں مولانا نے قرآن مجید کی ایک سو ایک آیات نماز سے متعلق جمع فرمائی ہیں، اس عاجز کو اعتراف ہے کہ مولانا کی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں کن کن عنوانات سے نماز کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کتاب میں آیات کے علاوہ نماز سے متعلق تاکیدی اور ترغیبی وترہیبی حدیثیں بھی اور آخر میں آئمہ امت کے ارشادات بھی ذکر فرمائے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کتاب نہایت موثر ہے اور علمی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بلند ہے، مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب کی یا اُس کے کسی حصہ کی کتابت بھی خود فرمائی تھی۔ (حضرت مولانا نہایت جمیل الخط تھے اور بدخط تحریر سے گرانی ہوتی تھی) لکھنؤ کے متعدد واقف حضرات سے میں نے سنا ہے کہ یہاں نماز کا رواج بہت کم تھا بہت سی مسجدیں غیر آباد تھیں، الحمدللہ اب یہ بات نہیں ہے، ان حضرات نے بتایا کہ اس میں سب سے بڑا دخل حضرت

مولانا مرحوم کے مواعظ کا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق: اس سے ملتی جلتی دوسری قابل ذکر خصوصیت قرآن مجید کے ساتھ حضرت مولانا کا خاص شغف اور تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے چھ صاحبزادے عطا فرمائے تھے (جن میں سے دو کا سامنے انتقال ہو چکا ہے) مولانا نے اُن سب کو قرآن مجید حفظ کرایا[1] ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا وہی کرے گا جس کو اللہ کی کتاب پاک کے ساتھ غیر معمولی شغف ہو، مولانا پہلے خود حافظ قرآن نہیں تھے، لیکن اب سے چند ہی سال قبل بالکل بڑھاپے کے دور میں خود محنت کر کے حفظ کیا اور زندگی کے ان چند اخیر سالوں میں تو بس تلاوت قرآن ہی ان کا دن رات کا شغل اور وظیفہ تھا، گذشتہ آٹھ دس سال میں صبح یا شام جس وقت بھی حاضری کا اتفاق ہوا یہی دیکھا کہ قرآن مجید سامنے ہے اور اس کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ اپنے خاص اہل محبت اور نیاز مندوں تک کا زیادہ آنا اور دو چار منٹ سے زیادہ بیٹھنا باعث گرانی ہونے لگا تھا، اس گرانی کا اظہار زبان سے تو میں نے کبھی نہیں سُنا لیکن دو تین منٹ کے بعد چہرے سے محسوس ہونے لگتا تھا کہ انہیں شغل تلاوت کا یہ انقطاع شاق ہو رہا ہے اور وہ منتظر ہیں کہ آنے والا رخصت ہو تو وہ اپنے شغل میں مشغول ہوں۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

[1] بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے دو بھائی اپنی بیماری کی وجہ سے پورا قرآن مجید حفظ نہیں کر سکے تھے، اگرچہ مولانا نے اس کے لیے پوری کوشش فرمائی۔

تبصرہ کتب

محمد اورنگ زیب اعوان
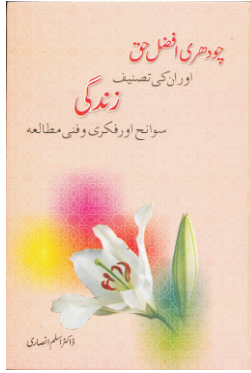
نام کتاب: چوہدری افضل حق اور ان کی تصنیف زندگی
(سوانح اور فکری و فنی مطالعہ)

تحریر: ڈاکٹر اسلم انصاری

صفحات: 280

قیمت: =/275 روپے

ناشر: دارالکتاب، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور۔

زیرِ نظر کتاب محترم ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کی شب و روز محنت و ریاضت کا ثمرہ ہے۔ مفکرِ احرار چوہدری افضل حق صاحب مرحوم کی مایہ ناز تصنیف ''زندگی'' کے فکری و فنی مطالعہ نے ''زندگی'' کے مطالعاتی سفر کو آسان کر دیا ہے۔

اس کتاب میں ''زندگی'' کی تمام اُلجھنوں کا حل اور کٹھن مقامات کی تسہیل و تشریح کی گئی ہے۔

ہر حوالہ با حوالہ، ہر دلیل با دلیل، حقائق و شواہد کی روشنی میں کتاب ''زندگی'' کو پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل سے پہلے ''پیش لفظ'' کے عنوان کے تحت باون (52) صفحات میں چوہدری افضل حق مرحوم سے متعلق اپنی وجۂ عقیدت اور مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اختصار اور جامعیت کی یہ کامیاب کاوش، اپنی مثال آپ ہے۔ ''پیش لفظ'' میں بیاسی (82) کتابوں کے حوالہ جات سے مزین کہکشاں سجائی گئی ہے، جس سے چوہدری صاحب مرحوم کی حیات و خدمات کو روز روشن کی طرح منور کیا گیا ہے۔ کتاب کا ہر باب قرآن وحدیث اور تاریخ کے حوالوں سے مزین ہے۔ اکثر مقامات پر چوہدری صاحب مرحوم کی ادبی تحریروں کے لعل وجواہر بھی سجائے گئے ہیں، ہر انتخاب، انتخابِ لاجواب ہے جس نے کتاب کے حُسنِ ظاہری و باطنی کو دوآتشہ کر دیا ہے اور یوں ڈاکٹر اسلم صاحب انصاری کی یہ محنت نورٌ علیٰ نور ہوگئی ہے۔

چوہدری افضل حق مرحوم اُردو ادب میں ایک ممتاز اور منفرد مقام کے حامل رہے ہیں۔ ان کی کتابیں اُردو ادب میں اپنے خاص اسلوب، اخلاقی اور مقصدی نقطہ نظر کی وجہ سے ایک خاص امتیاز کی حامل ہیں۔[1]

آپ صاحبِ اسلوب ادیب تھے، اسلوب ہی سے ادیب کی اَدبی حُسن کاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ ایک ایسے انشا پرداز تھے جو اپنے خاص اندازِ تحریر کی بنا پر پہچانے جاتے تھے کیونکہ آپ کی نثر کا اپنا ہی رنگ و آہنگ ہے۔

صوتی ہم آہنگی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

1 سپیدۂ صبح دلہن کی نیند سے کھلنے والی آنکھوں کی طرح آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا، اور موسم طفلِ معصوم کے تبسم سے زیادہ خوشگوار تھا۔ پرندے اپنے اپنے دلکش نغموں سے کلیوں کو بیدار کر رہے تھے۔

2 لیکن میرے گھر کی تنگی اور تاریکی سے کچھ وہ پریشان اور اس کے شایانِ شان سامان نہ ہونے سے میں حیران۔

3 نزدیک آکر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، میں نے سلام کا جواب دے کر ہاتھ ملایا۔

4 لیکن مجھے متفکر سا پا کر گھبرا گئی، گویا لمحہ بھر کے لیے بہار آئی اور پھر خزاں چھا گئی۔

5یا تو وہ ناز برداریاں یا یہ تغافل شعاریاں۔
6وہ باتوں سے پھول برساتی اور مسکرا کر بجلیاں گراتی تھی۔
7اس سے بہارستان کے پہلو میں انتظار کا جو خارستان تھا۔
اسی طرح رعایت لفظی کی صرف دو مثالیں پیش خدمت ہیں:
1پوچھا کہ ''تصاویر، آئینے اور دوسرے سامانِ آرائش کا کیا حال ہے؟'' کہا جب آپ نے رونمائی کی قسم کھالی تو مجھے سامان خودنمائی کی کیا حاجت۔
2اس کی نگاہِ غلط انداز میں ایک دعوت پنہاں تھی۔آخر دستر خوان پر کھانا چُنا گیا۔میں تو دل وجگر کو کباب بنا رہا تھا اور نظروں کے تیر کھا رہا تھا اور خانِ دوراں مجھے کم خوری کا مجرم ٹھہرا رہا تھا۔
یہ ہیں چوہدری افضل حق کی ''معجز بیانیاں''، جنہیں ڈاکٹر اسلم انصاری نے فکری وفنی مطالعہ کے عنوان سے اردو ادب کے شائقین کی خدمت میں پیش کیا ہے جس پر ہم انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔
چوہدری افضل حق مرحوم کا اَشہبِ قلم زُلفِ تحریر کے پیچ وخم سے بے گانہ نہ تھا، آپ کی تمام کتابیں اُردو ادب کا شہکار ہیں۔ان ہی میں سے ایک کتاب ''دینِ اسلام'' ہے۔جو اپنے موضوع کی مناسبت کے اعتبار سے انتہائی شاندار ہے، چوہدری صاحب کے سحر طراز قلم نے خوب اپنی جولانی دکھائی ہے۔ ارکان اسلام اور ان سے متعلقہ موضوعات پر آپ نے اپنے قلم کا جادو جگایا ہے۔مگر اس کتاب کے صفحہ نمبر 64پر ''کوزے میں دریا'' کے عنوان کے تحت سورۂ ال عمران کی آیت نمبر 130 کے ذیل میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سود کے حوالہ سے جن تاثرات وخیالات کا اظہار کیا ہے وہ انتہائی گستاخی پر مبنی ہیں۔ ناشرین کتاب یا چوہدری صاحب کے مُنتسبین اگر اس عبارت پر نظر ثانی فرمائیں اور اسے اس کتاب سے حذف ہی کر دیں تو بہت مناسب رہے گا۔یہ ایک عبارت چوہدری افضل حق کی تحریک آزادی اور مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے دی گئی ہے تمام قربانیوں اور خدمات کے علی الرغم

''بُغضِ صحابہ'' کی عکاسی ہی نہیں کرتی بلکہ آئینہ دار بھی ہے۔ جو کسی بھی طور نہ تو اہل السنۃ والجماعۃ کا شعار ہے اور نہ ہی ایک عظیم مسلمان انقلابی رہنما کے شایان شان۔

امید ہے کہ ہماری اس مخلصانہ و دردمندانہ گذارش کو ''تنقیدی'' نہیں ''اصلاحی'' سمجھا جائے گا اور اس خطرناک عبارت کی تلافی کی کوئی صورت ضرور بروئے کار لائی جائے گی۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے جتنی محنت سے یہ کتاب تیار کی، ناشرین نے اتنی ہی محبت اور عقیدت سے اسے شائع کیا ہے، کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ انتہائی شاندار البتہ کاغذ قدرے نامناسب، قیمت بھی زیادہ ہے۔

ہوشربا مہنگائی، کاغذ کی گرانی، سبھی حق، مگر قیمت اگر مناسب ہو تو خریدنے والوں کو سہولت رہتی ہے اور کتاب ہاتھوں ہاتھ خرید لی جاتی ہے۔
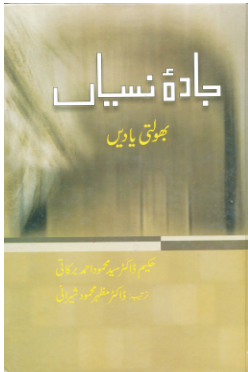
نام کتاب: جادۂ نسیاں (بھولتی یادیں)
مصنف: حکیم ڈاکٹر سید محمود احمد برکاتی
صفحات: 247
قیمت: =/225 روپے
ملنے کا پتہ: فضلی بک، سپر مارکیٹ۔ اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی

''جادۂ نسیاں''، حکیم ڈاکٹر سید محمود احمد برکاتی صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے جس کے مرتب ڈاکٹر

مظہر محمود صاحب شیرانی ہیں ۔چھتیس (36) شخصیات جنہیں انہوں نے قریب سے دیکھا ان سے متعلق تاثرات کو قلمبند کیا ہے۔ علاوہ ازیں ''جھلکیاں'' کے عنوان سے (9) مزید مضمون بھی شامل ہیں جن میں رام پور کی کچھ اَن کہی کہانیاں، فقیہہ شریعت و طریقت، مولانا شبلی کے صندوق کی چوری، مہمانان رسول ﷺ کی تکریم، خانوادہ برکاتی اور اصحاب پھلواری کے روابط، دھنّا لال جی، امام آخر الزمان سے ملاقات، حکیم جگناتھ پرشاد، سادھو مہاراج، شامل ہیں۔

مندرجہ بالا 36 موضوعات کی شخصیات، حکیم صاحب کے لیے ''مردم دیدہ'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان میں حکیم صاحب کی دادی صاحبہ، مولانا شرف الدین یاس ٹونکی، مولانا معین الدین اجمیری، علامہ سید مختار احمد، سلطان زاہد، اختر شیرانی، سیماب اکبر آبادی، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد شریف مبارک پوری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالرحمٰن چشتی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عبدالجلیل ٹونک ملاّ، حکیم نظام الدین اجمیری ،مولانا حکیم علاء الدین صدیقی، مولانا حکیم سید احمد حسین برکاتی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مالک رام، حافظ نصیر احمد اور حکیم محمد سعید سمیت کئی شخصیات شامل ہیں۔

ہر شخصیت سے ملاقات، ان سے متعلق ذاتی تاثرات، خوبیوں اور تسامحات سے متعلق بے لاگ تبصروں سے مزین یہ کتاب ہے۔

ڈاکٹر سعدیہ راشد (چیئر پرسن ہمدرد فاؤنڈیشن) کے بقول:

''گذشتہ نصف صدی میں جو شخصیتیں علم و حکمت کے آسمان پر روشن ہوئیں ان میں سے ایک عظیم اور نمایاں شخصیت مولانا محمود احمد برکاتی ہیں .... مولانا بہ یک وقت دینی علوم کے ممتاز فاضل اور طبی و تاریخی علوم کے بلند پایہ عالم کی ہمہ گیر شہرت رکھتے ہیں۔ان کا علمی ذوق اور مطالعہ کسی ایک شعبے تک

محدود نہیں۔ وہ طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و محقق بھی ہیں اور ادیب و مؤرخ بھی۔''

حکیم صاحب کی ذات گرامی سے ہمیں قوی امید ہے کہ انہوں نے جو لکھا سچ ہی لکھا ہو گا البتہ کئی مواقع پر ان کی آراء سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کی رائے سے اتفاق کیا جائے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب کی بکھری تحریروں کو یکجا کر کے شائع کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ علم دوست حلقوں میں ''جادۂ نسیاں'' کی پذیرائی کی جائے گی۔

کمپیوٹر کمپوزنگ، مضامین کی ترتیب، کاغذ، جلد سبھی میں نفاست اور اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ ان تمام تر خوبیوں کے باوجود قیمت قدرے زیادہ ہے اگر کم قیمت رکھی جاتی تو بہت مناسب رہتا۔

☼ ...... ☼ ...... ☼

جو لوگ مذہب کو مصلحت کی انگشتری میں نگینہ کی طرح سجا لیتے ہیں وہ ہدایت اور عقیدہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بے علم اور سادہ دل لوگ بھی راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ ایسی نظر بندی ہوتی ہے کہ جو نہیں ہے وہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اس مقام پر مذہب اور تجارت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ عبادت اور تماشا ایک ہو جاتے ہیں۔ توہمات، بدعات اور خرافات کی ہوحق ہوتی ہے۔ ایک دن یہ دونوں گروہ آپس میں جھگڑیں گے۔ ایک دوسرے پر الزام رکھیں گے۔ اس دن انہیں یاد دلایا جائے گا کہ ایک ہادیؐ آیا تھا، ایک کتاب لایا تھا۔ ہدایت کی راہ اور عقیدہ کی درستگی اسے نصیب ہوئی جس نے صرف ان کی پیروی کی تھی۔

اے گرفتارِ افسانہ و فسوں، اے پرستارِ پیچ و زبوں، کیا تم نے کتاب اور صاحبِ کتاب کا حق ادا کیا تھا؟ اس خیال سے دل کو قرار آ گیا۔ کسک کی جگہ سکون نے لے لی۔ میرے اور پتھر والوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔

(لوحِ ایام، مختار مسعود، ص:۱۸۳)

نور کی برکھا

مفتی محمد سعید خان

ہادی کامل ، رہبر اعظم
عبدیت کا مظہر خاتم
جس سے پھیلا نور ہدایت
کفر کا عالم درہم برہم
حسن سراپا جس میں سمٹا
صبح بہاراں ، خیر مجسم
جس کا ہر اِک نطق مدلل
جس کا مدح خواں خالق عالم
ظلم اور نفرت جس نے مٹائے
سب جگ میں وہ ارحم ارحم
الفت کے وہ دیپ جلائے
ہر سو برسی پیار کی شبنم
قبلہ نما و جلوۂ فاراں
تجھ سا کون ہو دکھ کا مرہم؟
مَا اَوْحٰی کا کامل جاذب
تیری امانت عفت مریم
میں بھی دعائے کرم کا طالب
برسے نور کی برکھا جم جم

بروز جمعۃ المبارک: بوقت دن ۱۱ بجے
۱۹/ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
25/مارچ 2011ء